(7) (17)

رابطۂ ادبِ اسلامی (عالمی) کا سہ ماہی اُردو ترجمان

کاروانِ ادبِ اسلامی

زیر سرپرستی

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم

مدیر مسئول

مولانا محمد رابع حسنی ندوی

ناشر

مرکزی دفتر رابطۂ ادبِ اسلامی (عالمی)

پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ ہندوستان

SAMPLE PUBLICATION

کاروانِ ادب اسلامی

اُردو سہ ماہی رسالہ

سرپرست اعلیٰ:۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی صدر رابطۂ ادبِ اسلامی (عالمی)

مجلس مشاورت:۔ مولانا محمّد ناظم ندوی ۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی دہلی ۔ پروفیسر عبداللہ عبّاس ندوی مکّہ مکرّمہ

پروفیسر عبدالحلیم ندوی دہلی ۔ پروفیسر حبیب الحق ندوی جنوبی افریقہ

پروفیسر ابوالخیر کشفی ۔ پروفیسر تحسین فراقی ۔ مولانا محمّد سلطان ذوق ندوی

مدیر مسئول:۔ مولانا محمّد رابع حسنی ندوی ناظم شعبۂ برصغیر

مجلسِ ادارت:۔ ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی جے۔ این۔ یو۔ دہلی

ڈاکٹر سیّد ضیاء الحسن ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ڈاکٹر ظفر احمد صدّیقی ندوی۔ بی۔ ایچ۔ یو۔ بنارس

مولانا مذر الحفیظ ندوی لکھنؤ

معاون انتظامی:۔ اقبال احمد ندوی

معاون طباعت:۔ محمّد سعفران ندوی

طباعت:۔ لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس (آفسٹ) لکھنؤ

کتابت و تزئین:۔ حامد بستوی

زرِ تعاون

فی شمارہ	چالیس روپے
سالانہ برائے ہندوستان	ایک سو پچاس روپے
〃 پاکستان و بنگلہ دیش	تین سو روپے یا دس ڈالر امریکی
〃 ان کے علاوہ دیگر ممالک	چار سو روپے یا بارہ ڈالر امریکی

پتہ:۔ صدر دفتر رابطۂ ادبِ اسلامی (عالمی)

پوسٹ بکس ۹۳ (ندوۃ العلماء) لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۷ یو۔ پی

RABT-E- ADAB ISLAMI ALAMI

POST BOX NO: 93

NADWATUL ULAMA LUCKNOW

فہرست مضامین

کاروانِ ادب اسلامی ـــــــــ شمارہ پنجم

اپریل تا جون ۱۹۹۵ء

۱	... منزل بہ منزل	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۶

مقالات

۱	دانتے کی کامیڈی پر اسلامی اثرات (۱)	پروفیسر حبیب الحق ندوی	۱۵
۲	حضرت عبداللہ بن رواحہ میدان عشق و جہاد کے شہسوار	مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۲۹
۳	کاروانِ عمر نشور	رضوان اللہ	۵۵

شعر و ادب

۱	(قند فارسی) زہجوری برآمد جاں عالم	ع ۔ ع ۔ ن	۶۴
۲	غزل	شیث محمد اسماعیل اعظمی	۶۵
۳	بزبان رابطہ ادب اسلامی	مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری	۶۶

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے اثرات اردو زبان و ادب پر

مذاکرۂ علمی منعقدہ :- دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، بتاریخ ۱۱-۱۲ر نومبر ۱۹۸۷ء

منتخب مقالات

۱	ابتدائیہ	ادارہ	۶۹
۲	زبان و ادب پر تحریک کے اثرات	پروفیسر عبداللہ عباس ندوی	۷۰
۳	سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا اثر پشتو ادب پر	پروفیسر محمد اشرف سلیمانی	۷۸
۴	معروف اہل قلم کی تصنیفات میں تحریک سید احمد شہیدؒ کی بازگشت	پروفیسر محمد راشد ندوی	۸۳
۵	سید احمد شہیدؒ کی تفسیر سورۂ فاتحہ اور اس کا اسلوب	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی	۹۵
۶	تقویۃ الایمان کا فکری و ادبی اسلوب	پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی	۱۱۰
۷	الدر المنثور کا اجمالی تعارف	ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری	۱۱۷
۸	کلام اقبالؔ میں شہادت کا رنگ	ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی	۱۳۲
۹	اردو شاعری پر سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے اثرات	ڈاکٹر طفیل احمد مدنی	۱۴۰
۱۰	اردو زبان و ادب پر تحریک سید احمد شہید کے اثرات	ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی	۱۴۸
۱۱	اردو نثر نگاری اور سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد	مولانا فرید احمد اعظمی فلاحی ندوی	۱۵۴

سیمینار کے موضوع سے متعلق دیگر مقالات اور نظمیں

مقالات

۱	تحریک تجدید دین	مولانا سید سلیمان ندوی	۱۶۶
۲	فاتح زمانہ	مولانا ابوالکلام آزاد	۱۶۸
۳	شہدائے بالاکوٹ کا مقام و پیغام	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی	۱۷۲
۴	حضرت سید احمد شہید بریلوی	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	۱۷۷
۵	حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک اصلاح و جہاد	پروفیسر خلیق احمد نظامی	۱۸۰

شعری حصہ

۱	مناجات	حکیم مومن خاں مومن	۲۰۷
۲	مثنوی جہاد	" "	۲۰۸
۳	امام جہانیاں احمد	" "	۲۰۹
۴	مرد قلندر، مقام عاشقی	علامہ اقبال	۲۱۰
۵	حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے مزار پر	مولانا محمد ثانی حسنی مرحوم	۲۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منزل بہ منزل
ادب اور زندگی

(۱)

★ محمد رابع حسنی ندوی

الحمدللہ رابطہ ادب اسلامی کے علمی وادبی ترجمان "کاروانِ ادب" کے اس شمارہ سے اس کے دوسرے سال کا آغاز ہو رہا ہے، سال اول میں چار شمارے پیش کئے گئے، جن کو اہلِ علم وادب نے عموماً پسندیدگی اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اس طرح انھوں نے ہم کارکنان کے حوصلہ کو بڑھایا، اور ہم اس مجلہ کے دائرہ میں بھی منزل بہ منزل چلتے ہوئے اگلے سال میں داخل ہو گئے۔

مجلہ کے ادارۂ تحریر نے شروع ہی سے یہ نظام طے کیا تھا کہ ہر شمارہ رابطہ ادب اسلامی برصغیر کے تحت منعقد ہونے والے سالانہ مذاکرات علمی میں سے کسی ایک کے مقالات بھی دیا کرے گا۔ چنانچہ اب تک چار مذاکرات علمی چار شماروں میں آچکے ہیں، اب ہمارے پاس کم از کم چھ مذاکرات علمی باقی ہیں، جو اسی طرح بتدریج مسلسل آئندہ شماروں میں آتے رہیں گے، تازہ پرچہ میں "اردو زبان وادب پر سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے اثرات" مذاکرۂ علمی کے مقالات دیئے جا رہے ہیں، اور یہ حسب معمول سابق انتخاب سے دیئے جا رہے ہیں،

(۲)

مذاکرۂ علمی کے مقالات کے حصّہ سے قبل مجلّہ کا عمومی حصّہ ہوتا ہے۔ مجلّہ کا یہ شروع کا حصّہ علمی و ادبی تنوع کا حامل ہوتا ہے، اس میں تخلیقی، فنی اور تنقیدی نوعیتوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے، اور خصوصیت کے ساتھ جس بات کا مجلہ کے دونوں حصوں میں لحاظ ضروری سمجھا جاتا ہے وہ اسلامی نقطۂ نظر اور تصور ہے، اور یہی بات ہمارے رابطہ ادب اسلامی کا بنیادی مقصد ہے۔ بنیادی مقصد کے لفظ سے یہ مراد نہیں کہ رابطہ ادب اسلامی کے پیش نظر مذہب کے کسی ایک خاص قسم کے فکر و تخیل کی ترویج ہے، اس امر کی وضاحت رابطہ ادب اسلامی کا تعارف کرانے والوں نے شروع سے کی ہے، رابطہ ادب اسلامی کے ذمہ داروں کی نظر میں ادب اسلامی دینداری کی مخصوص عملی شکلوں یا اس کے لئے اصلاحی و تحریکی طریقے میں محدود نہیں ہے، رابطہ نے اپنے پیش نظر ادب کو زندگی کی ان وسعتوں میں پھیلا کر کے چلنے کا عزم کیا ہے جن کو اسلام نے ایک مسلمان کے لئے جائز و روا رکھا ہے، اسلام انسان کی فطرت کا پورا لحاظ رکھنے والا مذہب ہے، اس نے انسانی فطرت کے تقاضوں کو روکا یا بند نہیں کیا ہے، صرف اس کے راستے متعین کئے ہیں، یہ راستے خود انسان کے فلاح و بقاء کے ہیں، انسان کے فلاح و بقاء کے ان راستوں سے اپنے کو آزاد رکھنے میں فوری لذّت و وقتی منفعت جو بھی حاصل ہوتی ہو، لیکن نتیجتاً وہ انسانی معاشرہ کی تباہی و بربادی یا خود اس سے گریزاں شخص کی تباہی کا سامان ہوتا ہے، چنانچہ دنیا کے جن معاشروں میں تمام قیود سے آزادی ہے، وہاں کا حال صرف خراب ہی نہیں بلکہ ہولناک خرابی کے دائرے میں آچکا ہے، آدھے ڈالر تک پر جان لے لی جاتی ہے، سماجی بندھن بکھرتے جارہے ہیں، آبروئیں برملا لوٹی جاتی ہیں، اندرونی صحت برباد ہوتی ہے، اور یہ بربادی ایڈس تک پہونچتی ہے، یہ سب نتیجہ ہے زندگی کی ضروری احتیاطوں سے بھی آزاد ہوجانے کا جس کو فرد کی آزادی، ترقی پسندی اور تمدنی روشن خیالی کے ناموں سے اختیار کیا جاتا ہے۔

اسلام کی طرف سے اپنے ماننے والے پر ضروری احتیاط کی پابندی خود اس کی مصلحت اور بقاء کے فائدہ میں ہے، اور ادب اسلامی بھی اس احتیاط کا لحاظ کرتے ہوئے تمام روا رکھی گئی وسعتوں میں کام کرتا ہے۔ ہمارا رابطہ ادب اسلامی اسی احتیاط کے ساتھ جائز وسعتوں کا نہ صرف قائل ہے بلکہ عامل ہے اور ہمارا کاروان ادب اس کی جھلکیاں پیش کرتا ہے۔

یورپ میں انقلاب فرانس کے بعد جو تحریکیں اٹھیں، وہ دراصل یورپین ممالک کے سیاسی و مذہبی حالات و سخت ظالمانہ طریقہائے کار کا ردعمل تھیں، اور کسی چیز کے ردعمل میں منفی اثرات غالب ہوتے ہیں، چنانچہ یورپ میں اٹھنے والے ردعمل نے سیاسی نظام کو بالکل الٹ پلٹ کر دیا، اور مذہبی دائرے کو تنگ کر کے گرجا کی چار دیواری کے اندر محدود کر دیا، اس کے بعد یورپ کے اہل فکر و ادب کا جو ذہن بنا، اسی کے لحاظ سے اس نے دنیا کے دیگر نظامہائے حیات کو دیکھا، اُس نے اسلام کو بھی مسجد کی چہار دیواری کے اندر بند کرنے کی کوشش کی، حالانکہ دونوں کے درمیان فرق یہ تھا کہ یورپ نے رہبانیت کو اپنی اساس بنا رکھا تھا، جو کہ زندگی کے فطری تقاضوں سے جگہ جگہ ٹکراتی تھی، لیکن اسلام میں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے، لیکن ہمارے مغربی مفکرین کے یہاں نہ اتنی وسعت تھی کہ دوسروں کو ان ہی کے فکر و عمل کے دائرے میں رکھ کر دیکھیں اور نہ صلیبی جنگوں کے اثر سے وہ اپنے ذہنوں کو اتنا آزاد کر سکے کہ وہ اسلام کا مطالعہ رواداری اور غیر جانبداری کے ساتھ کر سکیں، پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ ہوئی کہ یورپ کے سیاسی و فکری و ثقافتی غلبہ نے مشرقی ذہنوں کو بھی اپنے سانچے میں ڈھالا، حتی کہ بہت سے مسلمانوں کے ذہن بھی یہی سمجھنے لگے کہ اسلام میں بھی مذہب کا زندگی کی وسعتوں سے کوئی جوڑ نہیں ہے، حالانکہ یورپ میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی خواہ سماجی پہلو ہوں یا سیاسی یا دیگر، جو گنجائش ہے، اس کو اسلامی شریعت کا ادنیٰ مطالعہ کرنے والا بھی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، اور اسلامی نقطۂ نظر سے مذہب اور زندگی کے مختلف شعبوں کے مابین جو علمی وابستگی ہے، وہ کسی واقف کار سے مخفی نہیں ہے، اسی لئے جب ہم ادب کے ساتھ ساتھ

اسلامی کی نسبت اختیار کرتے ہیں تو تعجب پیدا کرنے والا کوئی کام نہیں کرتے، لیکن کچھ ذہنوں میں تعجب اُبھرتا ہے۔ رابطہ ادب اسلامی اسی تعجب کے پیدا ہونے کے سلسلہ کو ختم کرنا چاہتا ہے، اور وہ اپنی جد و جہد سے ادب اور اسلام کے درمیان جو علیحدگی کا غلط احساس ہے، اس کو دور کرنا چاہتا ہے۔

ہم کو کسی بھی ادبی نمونے کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے تعیین کے لئے اس کو ان وسعتوں اور احتیاطوں کے دائرے میں رکھتے ہوئے دیکھنا ہوگا جو ہم کو اسلام کی طرف سے واضح رہنمائیوں میں بتائی گئی ہیں، وہ ادبی نمونہ جس قدر ان سے مطابقت رکھتا ہوگا اسی قدر اس کو اسلام کے نقطۂ نظر سے صحیح سمجھا جائے گا، اور جس قدر وہ ان سے گریزاں ہوگا اسی قدر اس کو اسلامی نقطۂ نظر سے دور سمجھا جائے گا۔

مکہ کے ایک شاعر جو مذاہب کی تعلیمات سے واقفیت کے اثر سے جنت، دوزخ، آخرت، خدا اور اسکی رضا جیسے خیالات سے واقف ہوگئے تھے اور اپنی شاعری میں ان کا تذکرہ کرتے تھے لیکن اسلام سے ان کو ایسی ضد ہوئی کہ اس کی بُری طرح مخالفت کرنے لگے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے ایک رفیق سفر سے ان کے اشعار سنانے کی فرمائش کی اور بار بار فرمائش کرکے سنتے رہے۔ پھر فرمایا کہ "آمن لسانه وكفر قلبه" ان کی زبان نے تو ایمان والی باتیں کہیں لیکن ان کا دل ایمان نہ اختیار کر سکا۔

اسی طرح ایک شاعر مسلمان ہوئے اور انھوں نے ایک نظم کہی جس میں حضور صلی اللہ کی مدح اور شاعرانہ مضمون کے ساتھ اپنی بڑائی کا بھی تذکرہ کیا۔ یہ نظم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی، آپؐ نے اس کو خوش اخلاقی کے ساتھ سنا، اس نظم میں ایک شعر ایسا آیا جس میں تعلّی کا انداز حدود بشریت سے آگے بڑھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ شعر یہ تھا کہ :

بلغنا السماء مجدنا وجدودنا

وانا لنرجو فوق ذٰلك مظهرا

کہ ہماری عزت و عظمت آسمان تک پہونچ چکی ہے اور اب ہم امید کرتے ہیں کہ اس سے بھی آگے جائے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کو خدا تعالیٰ کے مقام سے گستاخی کا شبہ کرتے ہوئے ٹوکا، لیکن آپؐ نے اچھے انداز میں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ کہاں تک پہونچنے کا قصد ہے اے ابو یسلی (ابو یسلی شاعر کی کنیت تھی) انھوں نے برجستہ جواب دیا کہ یا رسول اللہؐ جنت تک۔ آپ اس جواب سے مطمئن ہو گئے کہ ان کے کلام میں شانِ خداوندی سے برابری دکھانے کی شوخی نہیں ہے۔ آپؐ کا ان کے اشعار خوش اخلاقی سے سننا پھر ایک شعر میں جو ایک شک پیدا کرنے والا مضمون محسوس ہوا، اس پر ٹوکنا ایک رہنمائی کا ذریعہ بن گیا، کہ شاعر کو فخر کرتے ہوئے کن حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔

اسلام نے مسلمانوں کا جو ذہن بنایا تھا اور ان کے خیالات، امنگوں اور حوصلوں کو اس کے دائرے کا پابند کیا وہ ذیل کے ایک واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے، وہ یہ تھا کہ ایام جاہلیت کے اصولوں میں یہ بات تھی کہ آدمی اگر اپنے خاندان کا یا اپنی پارٹی کا ہے تو وہ اچھا ہے، آنکھ بند کر کے تائید و مدد کا حقدار ہے، اور قابل محبت و تعلق ہے۔ لیکن اگر وہ مخالف خاندان کیمپ کا ہے تو خواہ حق پر ہو رواداری کا مستحق نہیں، چنانچہ یہ فقرہ مکاورہ بن کر رائج ہو گیا تھا کہ اپنے آدمی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو خواہ مظلوم، اسی کے مطابق جاہلیت کا شاعر کچھ لوگوں کی تعریف میں کہتا ہے کہ:

لایسألون اخاھم حین یندبھم
فی النائبات علیٰ ما قال برھانا

کہ یہ لوگ جب حوادث جنگ پیش آتے ہیں تو اپنے بھائی سے یہ نہیں پوچھتے کہ تم جنگ میں شرکت کے لئے بلا رہے ہو تو کس بات پر جنگ ہے، یعنی آنکھ بند کر کے مدد کرتے ہیں۔

اور ایک شاعر کہتا ہے:

وما انا الا من غزیۃ
ان غوت غویت وان ترشد غزیۃ ارشد

کہ میں تو قبیلہ غزیہ سے ہوں وہ خراب کام کریں گے تو میں بھی خراب کام کروں گا، وہ اچھا کام کریں گے تو میں بھی اچھا کام کروں گا۔

بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت وانصاف پسندی کی تعلیم دیتے ہوئے اس ذہنیت سے منع فرمادیا، اس طرح مسلمانوں کے لئے یہ رائج فقرہ ناقابل قبول ہوگیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فقرہ استعمال فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم، صحابۂ کرامؓ کا چونکہ آپؐ ذہن بدل چکے تھے، انھوں نے فوراً سوال کیا کہ یارسول اللہؐ! مظلوم کی مدد کرنا تو ہم سمجھتے ہیں لیکن ظالم کی مدد کیسے ہوتی ہے۔؟ تو آپؐ نے فرمایا: ظالم کی مدد اس طرح ہوتی ہے کہ اس کو ظلم سے روکو۔ اس طرح آپؐ نے اسلامی ذہن کے لئے وہ حدود بتادیئے جہاں تک مسلمان جاسکتا ہے اور جہاں سے اس کو آگے نہ بڑھنا چاہیئے۔

مسلمان کو خواہ ادیب ہو خواہ شاعر ہو ان سرحدوں کو جاننا ہوگا، اور ان کی پابندی کرنا ہوگی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں جن کو آپؐ کی توجیہات ورہنمائی ملی تھی، شاعر بھی تھے اور ادیب بھی، وہ اسلام کی بتائی ہوئی وسعتوں ہی میں اپنے ادب وشاعری کو چلاتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کو اجازت بلکہ تائید حاصل رہتی ان کی شاعری کی وسعتوں میں مدح بھی تھی اور مرثیہ بھی، غزل بھی تھی اور ہجو بھی، واقعہ بیانی بھی تھی اور احساسات کا اظہار بھی، لیکن ان سب میں رعایت تھی انسانی قدروں اور اسلام کی حدوں کی، ان کی اس احتیاط کو اس عہد کے مقتدر اسلامی شاعر حضرت حسان بن ثابت الانصاریؓ کے اس جملہ سے سمجھا جاسکتا ہے جو انھوں نے اس موقع پر کہا جب قریش کے بعض ایسے افراد کی طرف سے جو حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عزیز تھے، آپؐ کی ہجو کرنے کے جواب دینے کے ارادہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال فرمایا کہ تم ان لوگوں کی مذمت کیسے کروگے جب کہ میں خاندانی طور پر انھیں میں سے ہوں، اس پر انھوں نے کہا کہ میں آپؐ کو ان میں سے ایسا نکال لوں گا جیسے گیلے آٹے سے بال نکالا جاتا ہے

اچھی اور موثر زبان میں مختلف رعایتوں کے ساتھ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفوں کی ہجو کی اور خوب کی اور انھوں نے اپنے ایک دوسرے شعر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرتے ہوئے کہا:

فان أبي ووالده وعرضي
لعرض محمد منكم وقاء

"بلاشبہ میرے باپ اور میرے دادا اور خود میری آبرو، یہ سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کے تمھارے حملہ کو روکنے کے لئے سینہ سپر ہیں۔"

انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے دفاع اور ان کے بدخواہوں کی بدخواہی کے مقابلہ کے لئے اپنی شاعرانہ صلاحیت کو خوب خوب استعمال کیا اور اپنے فنی ہنر کا اظہار کیا، انھوں نے اپنی شاعری میں زور پیدا کرنے کے لئے غزل کی اصطلاحیں اور تعبیریں بھی فصاحت و جدت طرازی کے ساتھ استعمال کیں، اور چونکہ وہ معقول حدود سے باہر نہ تھیں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا، بلکہ ہمت افزائی فرمائی، بلکہ ایک موقع پر آپؐ نے یہ فرمایا کہ اسلام کی نصرت تلوار اور نیزے سے کی جاتی ہے شعر و شاعری سے بھی کی جانا چاہیئے۔ حضرت حسانؓ اپنی اس سخن گوئی کی بنا پر شاعر اسلام اور شاعر الرسولؐ کہلائے۔ اشعار کے اندر جذبہ و احساس و تأثر کی جو ترجمانی ہوتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اس کے صحیح انداز میں پورا محسوس کرتے تھے۔

اس کی اہم مثال وہ اشعار ہیں جو آپؐ کے قریشی عزیز کو ان کی اسلام دشمن سرگرمیوں کی بنا پر ان معافیوں میں شامل نہ کئے جانے پر جو فتح مکہ کے موقع پر عام طور پر دے دی گئی تھیں، قتل کر دیئے جانے پر ان کی بہن نے کہے تھے، اور ان میں آپ کو مخاطب کرتے ہوئے رنج و التجا کا موثر انداز اختیار کیا تھا، ان کو سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تأثر کا اظہار فرمایا کہ یہ اشعار اگر پہلے سنے ہوتے تو رعایت کر دیتے،

نثر کا دائرہ قرآن مجید کے نازل ہونے سے قبل عربوں میں بہت محدود تھا، قرآن مجید کے اثر سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے ذریعہ وسیع ہوا، اور اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی ادبیت کا اظہار ہوا۔ آپؐ اس میں تمام دیگر عربوں کے لئے معلم و رہبر نظر آتے ہیں، آپؐ کی تقریریں، گفتگوئیں، تذکرے، اظہار تأثر، دعائیں و مناجاتیں عربی کا بہترین ذخیرۂ ادب ہیں، اور آپؐ کے زمانہ اور آپؐ کے زمانہ کے بعد کی نثر پر آپؐ

کے ادب کی نمایاں چھاپ ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اقسام کلام میں آپؐ کے یہاں بھی تنوع ملتا ہے، مثلاً زن و شو کے آپسی تبصروں پر بھی ایک گفتگو آپؐ کے اور آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان ہوئی تھی جو آپؐ نے بیان فرمائی اور وہ حدیث میں محفوظ ہے، اس میں اس خاص گوشۂ ادبی کی بھی نمائندگی ملتی ہے، یہ حدیث ام زرع کے نام سے موسوم ہے۔

بہر حال اسلامی ادب کو ایک محدود و مجبور ادب محسوس کرنا صحیح نہیں ہے، اسلام کو صرف عبادت اور ترک دنیا کا مذہب سمجھنے والے ہی ایسا سمجھ سکتے ہیں، لیکن جو اسلام کو زندگی کی وسعتوں کا دور تک ساتھ دیتے ہوئے دیکھتے ہیں وہ اس کے مجبور و مقید سمجھنے کی غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتے۔

چنانچہ ادب کی اسلامی وسعتوں کے دائرہ میں وہ تحریر و کلام بھی آتا ہے جو کسی دینی تحریک سے وابستہ یا کسی مذہبی تصور کا حامل ہوتے ہوئے ادبی خصوصیات سے بھی متصف ہو۔

اسی میں حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ داعیوں اور مجاہدوں کی متعدد تصنیفات داخل ملتی ہیں جن میں پُر اثر مضمون بھی ہیں اور ادبی خصوصیات بھی ہیں۔

مقالات

سید حبیب الحق ندوی (قسط اوّل)

دانتے کی کامیڈی پر اسلامی اثرات

واقعہ معراج اور یورپ کی نشأۃ ثانیہ

ناقدین نشأۃ ثانیہ کے ظہور کی تاریخ اور وقت متعین نہیں کرتے۔ کیونکہ نشأۃ درحقیقت بیداری شعور کا نام ہے۔ البتہ نشأۃ کے وطن اٹلی پر سب متفق ہیں۔ اٹلی سے نشأۃ کی ابتداء کیوں ہوئی؟ سائمنڈ (Symonds) نے نشأۃ اٹلی پر Renaissance in Italy کے زیر عنوان سات اہم جلدیں لکھی ہیں۔ جلد چہارم میں علمی و فکری اور تعلیمی ارتقاء سے طویل بحث کرتے ہوئے اس نے نشأۃ اٹلی کی اصل وجہ اتالوی زبان کی اچانک ترقی کو قرار دیا ہے۔ یورپ کے دوسرے ممالک اب تک بربریت کے دور میں تھے اور ترقی زبان سے محروم بھی۔ اس کے برخلاف اتالوی یا اطالوی) زبان خاصی ترقی یافتہ ہو چکی تھی۔ ہر قسم کے افکار کے بار گراں کو سمونے کی وسعت اس کے اندر موجود تھی۔ اسی لیے لسانی لوچ نے ہر خیال کو بسرعت قبول کر لیا۔ ناقدین کے خیال میں اٹلی لسانی تفوق کے علاوہ علم و تجارت میں بھی دیگر مغربی ممالک سے آگے تھا۔ ان اسباب سے انکار نہیں لیکن راقم الحروف کی رائے میں نشأۃ کی اصل وجہ زندگی کے

نظریہ میں وہ بنیادی تغیر تھا جو بوکیچو ۱۳۱۳ء۔۱۳۷۵ء Boccaccio نے فراہم کیا تھا نیز روحانی بیداری اور حیات بعد موت کی جزاء و سزا کا انقلاب پرور روحانی تصور تھا۔ (جو اسلام سے لیا گیا اور جس کا ذکر آئندہ آئے گا) جسے دانتے نے اپنی طربیہ (کمیڈی) کے ذریعے رائج کیا۔ عہد وسطیٰ کے کسی طالب علم سے پوشیدہ نہیں کہ نشأۃ سے پہلے سارا یورپ روحانی اور اخلاقی انحطاط کے قعر مذلت میں گرفتار تھا۔ آخرت یا جزاء و سزا کے تصور کا وجود تک نہ تھا۔ اسی لیے معاصی اور جرائم معاشرہ پر سایہ فگن تھے کیونکہ مسئولیت اور جوابدہی کے تصور کا فقدان نہ صرف معصیت کو فروغ دیتا ہے۔ بلکہ ظلم و تشدد کو بھی پروان چڑھاتا ہے۔ بدقسمتی سے قدیم عیسائی عقیدہ کے مطابق انسان پیدائشی اور فطری طور پر عاصی اور خطاکار (Sinful) تھا۔ چونکہ انسان کو آدمؑ کے اصل گناہ (original sin) کا کفارہ ساری عمر اذیت پیہم کے ذریعہ (life-long suffering) ادا کرنا تھا۔ خود ملٹن عیسائی عقیدے کے مطابق انسانی کو پیدائشی عاصی تصور کرتا ہے۔ یہ گناہ آدم یا نافرمانی آدم کی سزا ہے جو ہر ابن آدم کی گردن پر ہے۔ عیسیٰ خدا کے بیٹے نے اپنی قربانی کے ذریعہ اس نافرمانی کا کفارہ ادا کیا۔ فردوس گم گشتہ (۱۶۶۷ء) درحقیقت سقوط آدم کی داستان ایک رزمیہ نظم (Epic of the fall of Man) ہے سقوط آدم اسی گناہ کی سزا تھی۔ غرض یہ عقیدہ سترہ اور اٹھارہ صدی تک طاقتور رہا اور عیسائیت کو ہنوز اس عقیدہ سے نجات نہیں مل سکی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف زندگی کی رعنائیوں پر قنوطیت کی اداسی تھی اور دوسری طرف فطری اور پیدائشی گنہگار انسان کو مزید جرائم و معاصی میں غرق ہونے سے کوئی چیز روکنے والی بھی نہ تھی۔ کیونکہ جب عصیان و خطا نوشتہ تقدیر تھا تو مزید گناہ سے اجتناب بھی بے معنی تھا۔ اس طرح قنوطیت اور عدم جواب دہی کے تصور نے زندگی کو بے رونق بنا کر گناہ اور ظلم کے دلدل میں دھکیل دیا تھا۔

قنوطیت کا علاج بوکیچو نے کیا اور نشاط حیات کا نسخہ پیش کیا۔ اپنی تمام ادبی و فکری اور تخلیقی قوتیں اس عیسائی عقیدہ کے ابطال میں صرف کیں جو انسان کو پیدائشی طور پر مجرم یا گنہگار قرار دیتا ہے۔ اس نے حیات انسانی کو پر بہار، جنت بداماں اور تحفہ قدسی قرار دیا۔ زندگی اس کی

نظر میں حسرتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ مسرتوں سے لبریز تھی اور بہار زندگی پر ہر لمحہ گل ہائے مسرت نچھاور کرنے کی ضرورت تھی۔ سرشاری و نشاط کے اس پیغام نے ایک بار پھر نیم وثنی مسرتوں (semi-Pagan Gladness) کو گدگدایا اور نشاطیت بے مہار ہو گئی۔ سوال یہ ہے کہ رعنائیت حیات کا نسخہ بوکیچو کے ہاتھ کہاں سے لگا؟ یہ نسخہ بوکیچو کو اسلامی مصادر سے ملا خلیفہ ہارون الرشید کے دور کا شاہکار "الف لیلہ" کے مطالعہ نے زندگی کو بہار اور جنت بداماں صورت میں بوکیچو کے سامنے پیش کیا۔ یورپ میں اب تک ایسی متحرک اور فعال زندگی کا تصور موجود نہ تھا۔ بوکیچو نے الف لیلہ کے نمونہ اور اسکیم پر اپنی سو کہانیاں ڈیکامیران Decameron کے نام سے شائع کیں جو لذاذ حیات کا فلسفہ تھا۔

مادہ اور روح کے امتزاج کے بغیر معتدل زندگی محال ہے۔ بوکیچو کی مادیت کو دانتے (موت ۱۳۲۱) کی روحانیت درکار تھی۔ دانتے کی طربیہ نے یہ کمی پوری کر دی۔ کیونکہ اس نے ایک ایسی زندگی کا خاکہ پیش کیا جو آخرت کی زندگی اور روحانی شادکامیوں سے سرشار تھی۔ اس طرح بوکیچو کی حیات فطری کی خواہشات اور مطالبات نفس کے سریلی ترانوں کو روحانی زبان مل گئی۔ اسی لیے ڈیکامیران کا نام طربیہ انسان (Commedia Ummana or human comedy) پڑ گیا جب کہ دانتے کی رزمیہ ارواح کا نام طربیہ قدسی (The Divine comedy) ہو گیا۔ اب دانتے بوکیچو روحانی اور مادی زندگی کے ترجمان بن گئے۔ سائمنڈ کا تبصرہ درست ہے کہ ایک نے خواہشات نفس کو دبایا جبکہ دوسرے نے اس کی رعنائیوں کو ابھار کر مائل بالتلذذ بنایا۔ ڈیکامیران نے نفس انسانی کو عالم مثالی پر ترجیح دی۔

Dante condemned natural appetite and Boccaccio celebrated it.

Decameron vindicated the claims of appetite and sensuous enjoyment against ideal aspiration

(ملاحظہ ہو جلد اوّل کا مقدمہ اور جلد چہارم کے وہ ابواب جن میں اٹلی کی نشاۃ پر اسلامی اثرات کے اعترافات موجود ہیں) یورپ میں فن کہانی نویسی الف لیلہ کی مرہون منت ہے۔ کچھ نے براہ راست الف لیلہ سے استفادہ کیا اور کچھ نے بالواسطہ۔ شیکسپیئر نے بھی اس

اس سے استفادہ کیا۔ اس نے اپنی سمبلائن (SYMBELINE) مرچنٹ آف وینس، رومیو جولیٹ، ٹو جنٹلمین آف ویرونا اور آل از ول ویٹ اینڈ زول (All is well that ends well) کے پلاٹ اخذ کیے۔ لانگ فلو، ورائٹن، کیٹس اور ٹینی سن بھی اس سے مستفید ہوئے چاسر نے اپنی کنٹربری ٹیلز کا پلاٹ بھی وہیں سے اخذ کیا۔ اسی طرح ویکامیران جس کی اصل الف لیلہ ہے۔ یورپ میں مقبول ہوئی۔

نشاۃ اٹلی کا تیسرا قائد پٹرارچ (Petrarch) ۱۳۰۴ء سے ۱۳۷۴ء) تھا۔ اس کی شہرت گیتوں اور سانٹ کے مجموعوں پر ہے۔ اس کی غزلوں اور گیتوں نے قومی شعور اور آرزوؤں کو جگایا۔ وہ دراصل ایک ( ) تھا۔ ان سب کا امام دانتے تھا۔ جس کی روحانیت نے پٹرارچ کی غزلوں اور بوکیچو کی حقیقت نگاری کو جو انتہا پسندی کا شکار ہو رہی تھی، متاثر کیا۔ دانتے نے اول تو کیتھولک عقائد کا احیا کیا اور معراج کی احادیث نبویہ کی نقل کر کے گنہ گاروں کو سزا یاب اور نیکو کاروں کو انعام یافتہ دکھا کر ملی و قومی امرض کا علاج کیا۔ ان تینوں ادبی مفکرین کے شاہکار نے تحریک اصلاحات کا آغاز کر دیا۔ جو اٹلی کی سرحدوں سے نکل کر سارے یورپ میں پھیل گئی اور یورپ کی معروف تحریک اصلاح Reformation مارٹن لیوتھر تک کی روح میں سرایت کر گئی۔

دانتے (۱۲۶۵-۱۳۲۱) اور ابن عربی

ابن عربی سے دانتے کے استفادہ کا اجمالی خاکہ پیش کیا جا چکا ہے یہاں ڈائی گرام اور نقشوں کے ذریعے ان کی تفصیلات کا ایک سرسری جائزہ قارئین کی دلچسپی سے خالی نہیں۔ یورپ اور عالم اسلام کے درمیان گہرے تجارتی روابط قائم تھے۔ مسلم یروشلم میں مسیحی یورپ کے زائرین کی آمد و رفت کے ذریعہ ان روابط میں اضافہ ہوتا رہا۔ صلیب کی طویل جنگوں کے بعد روابط بڑھے۔ خلفاء کے دربار میں عیسائی مشن کی تقرری وغیرہ ان تعلقات کی واضح علامتیں ہیں۔ نارمن حکمراں کا دربار سسلی مسلم کلچر کا مرکز تھا۔ اسلامی اندلس کے ساتھ سارے یورپ کا رابطہ قائم تھا۔ تولیڈو (Toledo) کا دربار اور پوپ ریمانڈ کا مدرسہ تراجم و اشاعت

مرد دانا الفانسو (The court of Alphonso the wise) نیز مرسیا اور سوائل میں تقابل ادیان کے مدارس وغیرہ کے ذریعے اسلامی افکار و عقائد کی اشاعت یورپ میں ہو رہی تھی (پلاکیوس مرجع سابق ص ۲۴۰-۲۴۵) اسلام کے عقیدہ حیات بعد الموت کی اشاعت یورپ میں انہی ذرائع سے ہوئی۔ ان عقائد کی اشاعت میں اسلامی اندلس پیش پیش تھا۔ مزارب اسلامی کے داستانی گیتوں سے واقف تھے۔ واقعہ معراج رابرٹ Robert of Reading کے تذکرہ (Summa) میں موجود تھا۔ خود پادری روڈری گو کی تاریخ عرب (Historia Araban) اور مرد دانا الفونسو کی داستانِ اسپین (Estoria D' Espanna) میں معراج یروشلم کا حال مذکور تھا۔ پادری پٹر پاسکل کی کتاب (impuna cion De la Sela De Mahomah) میں بھی معراج محمدیؐ اور حیات بعد الموت کے نظریات بلکہ اس کے متعلق پیشرو دیگر روایتیں بھی منقول تھیں۔ اٹلی میں روایتیں پٹر پاسکل کے ذریعہ پہنچیں۔ (ایضاً ص ۲۵۱)

دانتے معراج النبیؐ سے بخوبی واقف تھا۔ اس کا استاذ برونیتو لاطینی (Brunette Latin) مرد دانا الونسو کے دربار میں علوم عربیہ کے ممتاز عالم کی حیثیت سے معروف تھا۔ اسی زمانہ میں لاطینی کو معراج کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں ہوں گی۔ دانتے نے معراج کا علم اپنے استاذ سے حاصل کیا۔ دانتے خود بھی عربی کلچر سامی زبانوں کا شائق تھا۔ وہ تاریخ اسلام سے بھی واقف تھا۔ وہ عرب نجومیوں سے برملا استفادہ کرتا رہا۔

ابن عربی اور دانتے کے ہاں تقابلی خطوط تڑپ رہے ہیں۔ اظہار و بیان علامات حروف و اعداد کا استعمال۔ علم نجوم کی اصطلاحات عالم تخیل کی تجسیم، خوابوں کی تعبیر ابن عربی کے معروف فلسفہ عشق کا چربہ ہے۔ ابن عربی کی ترجمان الاشواق اور فتح الذخائر والاغلاق کے مضامین ہو بہو دانتے کے ہاں موجود ہیں۔ اسلامی متصوفانہ شاعری معروف تھی قرطبہ کے ابن الحزم کی طوق الحمامہ اور کتاب العشق والعشاق معروف تھیں۔ ابن عربی کی فتوحات میں عشق کا ایک خاص ماحول ہے۔ دانتے نے اس سے اپنی فضاء کو معمور کیا دانتے کی رزمیہ ارواح (کمیڈی) کی کلید اسلامی فلسفہ حیات بعد موت اور ابن عربی کے تصورات ہیں۔ کمیڈی کا اصل مصدر ہی فتوحات مکیہ ہے۔ اسی اسکیم پر دانتے نے اپنا رفیع ڈرامہ ارواح

کھڑا کیا ہے۔ نیکوکار اور متقی کی باسعادت زندگی کی جاندار تصویروں نورازلی کے دیدار کی سعادت اور دیدار کرنے والوں کی خودفراموشی و وارفتگی وغیرہ کا سراغ دانتے کو فتوحات سے ملا۔

تقابل متن Textual Parallelism

دانتے نے مسلم مفکرین کی تالیفات سے کمیڈی کی تخلیق میں جو مدد لی ہے اس کے دو ایک نمونے کافی ہیں۔ مثلاً اعراف کی تعبیر میں اس نے ابن مخلوف کے افکار سے مدد لی۔

اعراف کے کینٹو ۳۰ کے اشعار ۲۱ وغیرہ ملاحظہ ہوں۔ نیز کینٹو ۲۱ کے اشعار ۸۳ اور ۱۱۰ ملاحظہ ہوں اور ان کا موازنہ ابن مخلوف کی متقابل عبارتوں سے کیا جا سکتا ہے، ان مناظر میں دانتے کا قافلہ نور نمودار ہوتا ہے اور خیرہ کن تابانی حسن کے ساتھ مہ جبیں بیترس (محبوب دانتے) سامنے آتی ہے۔

تشکیل فردوس میں دانتے اور ابن عربی کی متقابل عبارتیں بھی ملاحظہ ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابن عربی نے بعینہٖ اس کا ترجمہ کیا ہے اور چربہ اُتارا ہے۔

ابن عربی اور دانتے کا نقشجاتی تقابل

اصل مصادر میں اس وقت راقم الحروف کے پیش نظر ابن عربی کی فتوحات مکیہ جلد سوم (جو ابن عربی کے اصل نسخہ یعنی قونیہ مخطوطہ کی روشنی میں علماء مصر نے عبدالقادر الجزائری کے ایماء پر مصر کے مطبع دارالکتب العربیہ الکبیر سے حاجی فداء محمد الکشمیری و شرکاء کے ذاتی اخراجات پر شائع کیا ہے۔ تاریخ طبع ندارد) اور دانتے کی کمیڈی (نفس مرجع۔ باب اوّل ملاحظہ ہو) بھی زیر نظر ہے۔

یہاں تفصیلات کا موقع نہیں۔ نقشجات کی کما حقہٗ معرفت کے لئے قاری جلد سوم کے مندرجہ ذیل ابواب اور صفحات کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ فتوحات کی جلدوں کا قاری بیک آواز شہادت دے سکتا ہے کہ یہ آورد نہیں آمد ہے بلکہ الہام ربانی ہے۔ ان کی تفسیر و تعبیر کے لئے ان گنت جلدیں درکار ہیں۔

اوپر گذر چکا ہے کہ ابن عربی نے اپنا نظریہ کون، جوہر و ہیولیٰ (ص ۴۲۱) پیش کر کے عالم نجوم کو حیرت زدہ کر دیا۔ عرش، استواء اور کرسی کا نقشہ، پانی پر عرش الٰہی کا ٹھہراؤ۔ (۴۲۲) فلک اطلس اور جنتوں کے نقشے۔ فلک کواکب اور شجرہ طوبیٰ کا نقشہ (۴۲۳) فلک کوکب اور قباب سموات، اس کے مستقر ارضی کی تصویر، ارکان ثلاثہ کی تعبیر، عمد کی شکل جس کے ذریعہ قبہ معدن نبات، حیوان اور انسان مشیت قدرت سے باہر نہیں جا سکتے (ص ۴۲۴) ارض حشر یا ارض محشر کی تصویر جس میں اعیان، مراتب عرش الفصل والقضاء اور صنوف ملائکہ کی تصویریں ہیں (ص ۴۲۵) جہنم اس کے ابواب و منازل کا نقشہ (ص ۴۲۶) دنیا و آخرت اور برزخ کا نقشہ (۴۲۷) الکثیب اور مراتب خلق یا تخلیق کا نقشہ (۴۲۸) تصویر عالم اس کے طبقات روحانی و جسمانی اعلیٰ و اسفل کی تعبیرات (ص ۴۲۹) وغیرہ وغیرہ۔ عمیق مابعد الطبیعیات تاملات کے محتاج ہیں۔

عجائب کون کے متعلق ابن عربی نے واضح کر دیا کہ تفصیلات کائنات محض مرقع خالق ہے اور ہمہ اوست کی شہادت ہے۔ وہی ذات باری کائنات کا مرجع ہے، کون اپنی گوناگوں شکلوں اور نوع بنوع صورتوں کے باوجود اصل میں ایک ہے۔ اس پر اللہ کی حکمرانی ہے۔ خود تخلیق کائنات کے پیچھے عنایت ایزدی پوشیدہ ہے۔ اگر اس کی عنایت نہ ہوتی تو مظہر کون نہ ہوتا (۴۳۲) یہ ابن عربی کا معروف ترین فلسفہ ہے۔ جس کی تفصیلات کا یہاں موقع نہیں۔ ابن عربی نے مندرجہ ذیل اشعار میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے ؎

انظر الی الکون فی تفصیلہ عجبا ومرجع الکل فی العقبیٰ الی اللہ
فی الاصل متفق فی الصور مختلف دنیا و اخرۃ فالحکم للہ
فی اللہ من کونہ مجلی لعالمہ ولا یری الکون الا اللہ باللہ
فاعلم وجودک ان الجود موحلۃ وکن بذاک علیٰ علم من اللہ

جہنم کی تفصیلات کے لئے فصل ششم (۴۴۰۔۴۴۱) اسماء الٰہیہ، دنیا آخرت اور برزخ کے لئے فصل ہفتم (۴۴۱۔۴۴۴) اور الکثیب اور مراتب خلق و تخلیق کے لئے باب ہشتم (۴۴۲) ملاحظہ ہوں۔ فصل نہم میں عالم اور کون کی تعریف کرتے ہوئے ابن عربی لکھتے ہیں کہ ماسویٰ اللہ ساری کائنات دنیا یا کون اور عالم ہے۔ العالم وھو کل ماسویٰ اللہ (الا کل شی ماخلا اللہ

بالمل فالجوهر الثابت هو العماء وليس الأنفس الرحمٰن والعالم جميع ما ظهر منها فيه من الصور (ص۴۴۳)

ان اشارات کی روشنی میں ابن عربی اور دانتے کے متقابل نقشجات ملاحظہ ہوں۔ قاری محسوس کرے گا کہ دونوں میں کیا مشابہت و مماثلت ہے۔ دانتے کا قاری محسوس کرے گا کہ وہ ابو عبداللہ محمد بن علی (المعروف بابن عربی) کی فتوحات مکیہ پڑھ رہا ہے۔

دانتے (Dante) کے مستعار خیالات کا نصی اور نقشہ جاتی تقابل

مذکورہ بالا مباحث کے بعد ضروری ہے کہ دانتے کے مستعار خیالات کا اسلامی ادب کے ساتھ نصی اور نقشہ جاتی تقابل کیا جائے تاکہ قاری دانتے کی شہرہ آفاق تخلیق ڈوائن کمیڈی" کے اصل اسلامی مصدر سے واقف ہو سکے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ فتوحات مکیہ میں ابن عربی کے مابعد الطبیعیاتی تصورات کا پورا خاکہ پیش نظر رہے (نقشے از ۱-۹) تاکہ دانتے کے ماخوذات کو سمجھنے میں آسانی ہو اور یہ واضح ہو سکے کہ جنّت کی ساخت اور بناوٹ، شجرہ طوبیٰ کے تصور میں احادیث معراج سے دانتے نے کس درجہ استفادہ کیا ہے۔ نیز احادیث کی صوفیانہ تعبیرات خاص کر ابن عربی کی فتوحات سے جہنّم کی ساخت کی تفصیلات کس حد تک اخذ کی ہیں۔ جہنّم کے سات اہم طبقات سجّین، حطمہ، لظمہ، سقر، سعیر، جحیم اور جہنّم ابن عربی کے ہاں اقلیدس کے نمونے پر دائروں (دائرہ در دائرہ) میں تیار کئے گئے ہیں۔ دانتے نے حرف بہ حرف اس کی نقل کی ہے۔ صرف دائروں میں اضافہ کر دیا ہے یعنی سات دائروں کے بجائے دس دائرے بنا دیئے۔ ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۶ (ابن عربی) اور نقشہ نمبر ۱۰ (دانتے اور ابن عربی کے متقابل نقشہ جات) ابن عربی کے ہاں آنکھوں کے ذریعہ گناہ کرنے والا سجین میں مبتلائے عذاب ہے اور کانوں کے ذریعہ گناہ کرنے والا حطمہ میں ہے۔ یہی ترتیب دانتے کے ہاں بعینہٖ موجود ہے۔ ابن عربی نے ہر طبقہ کو مربع میں تقسیم کیا ہے جس میں غیر مومن، ملحد، اور منافق مبتلائے عذاب ہیں۔ یہی ترتیب دانتے کے ہاں موجود ہے۔ ابن عربی نے ہر دائرے کو ذیلی دائروں میں (SEMI-CIRCLES) میں تقسیم کیا ہے وہی تقسیم دانتے کے ہاں موجود ہے۔ گنہ گار دو قسم

کے ہیں۔ خارجی جنھوں نے واقعتاً ارتکاب جرم کیا اور داخلی جنھوں نے گناہ کی نیت ضرور کی اور گناہ نہیں کیا۔ یہی تقسیم دانتے کے ہاں موجود ہے۔ ابن عربی کا جہنم اقلیدس کے اصول پر دائروں کی شکل میں بنا ہے۔ دانتے نے اسی شکل کی نقل کی ہے۔ فردوس کی تعمیر میں بھی دانتے کے خیالات ابن عربی سے ماخوذ ہیں (ملاحظہ ہو نقشہ ۱۱) ان کی تفصیلات اوپر گذر چکی ہیں یہاں نقشہ جات کی تفہیم کے لیے ان کا مختصر اعادہ ضروری ہے نقشہ جات کی تفصیلات کے لیے فتوحات مکیہ کے اصل صفحات جو مذکور ہیں، کی طرف مراجعت کی جائے۔

یورپ میں معراج النبی اور معراج النبی سے متعلق احادیث نبویہ پر وافر مواد موجود تھا اور ہے انھیں اسلامی مصادر کے ذریعہ اسلامی عقائد کا نفوذ عیسائی مذہب میں ہوا۔ مثلاً حیات بعد موت اور جزاء و سزا کا اسلامی تصور جو دانتے کی کیمڈی کی اساس ہے۔ یورپ میں قبول عام ہوا۔ بعض اہم مصادر اور کتب کا ذکر ضروری ہے۔ مثلاً ابو العلاء المعری کی رسالۃ الغفران۔ ابن عربی کی کتاب الاسراء الی مقام الاسریٰ۔ کتاب تنزلات الاملاک فی حرکات الافلاک، کتاب شق الجیب، مشاہد الاسرار القدسیہ و مطالع الانوار الالہیہ تفسیر الشیخ الاکبر، ترجمان الاشواق، بدائع فی وقائع الدہور۔ کمال الدین الدمیری کی کتاب حیات الحیوان الکبریٰ، غیطی کا حاشیہ علی قصۃ المعراج۔ سیوطی کی کتاب الدرر الحسان فی البعث و نعیم الجنان، ابن القاضی کی کتاب وقائق الاخبار فی ذکر الجنۃ و النار۔ ابن حزم الظاہری کی کتاب الفصل والملل والاہواء والنحل، ابن عربی کی کتاب الفتوحات المکیہ۔ غیطی کی المعراج الکبریٰ۔ غزالی کی کتاب احیاء علوم الدین۔ ابن حجر کی کتاب الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ۔ الشعرانی کی کتاب الکبریت الاحمر فی بیان علوم الشیخ الاکبر، ابن مخلوف کی کتاب العلوم الفاخرۃ فی النظر فی امور الآخرۃ۔ ابن قیم الجوزیہ کی کتاب مفتاح دار السعادۃ و منشور ولایۃ العلم والادارۃ۔ غزالی کی منہاج العابدین، شعرانی کی کتاب المیزان غزالی کی کتاب میزان العمل، ابو الاشعری کی کتاب شجرۃ الیقین و نحلۃ نور سید المرسلین۔ ابو عبد اللہ محمد بن علی الشاطبی کی کتاب الجمان فی مختصر اخبار الزمان (مخطوطہ) ابن عربی کی کتاب محاضرۃ الابرار و مسامرۃ الاخیار۔ قزوینی کی کتاب عجائب المخلوقات ثعلبی کی کتاب قصص الانبیاء المسمیٰ بالعرائس، غزالی کی القسطاس المستقیم۔ قشیری کی الرسالۃ القشیریہ فی علم التصوف۔ ابن سینا کی تسع

رسائل فی الحکمۃ والطبعیات سیوطی کی کتاب شرح الصدور، شرح حال الموتیٰ والقبور۔ جریر طبری کی کتاب جامع البیان فی تفسیر القرآن۔ شعرانی کی کتاب الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الاکابر ــــ وغیرہ وغیرہ کتب یورپ کے علمی حلقوں میں معروف تھیں۔ ان افکار کی عالمی اثر پذیری سے انکار ممکن نہیں۔ یہ نام محض اشارۃً پیش کیے گئے ورنہ لاتعداد کتب اس موضوع پر معروف تھیں اور ہیں۔

نقشہ نمبر ۱۰ (ابن عربی اور دانتے کے متقابل نقشہ جات، جہنم)

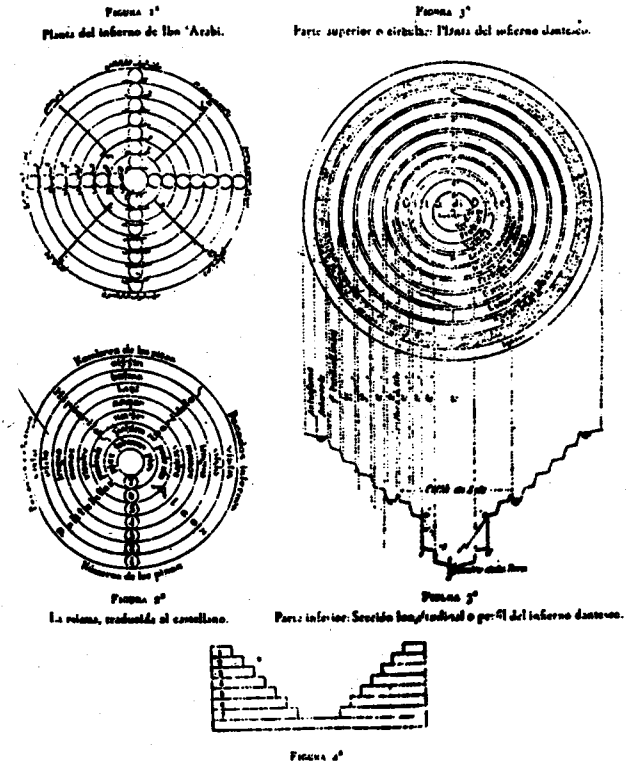

دانتے کے اصل نقشہ کے لیے ملاحظہ ہو پلاکیوس (ص ۱۴۷) سے زیادہ واضح نقشہ اس کے انگریزی متن (ص ۹۵) پر ملاحظہ ہو پورینا (Parena) کا یہ معروف ترین نقشہ یورپ میں

بے حد مقبول ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ دانتے کی اپج نہیں ابن عربی کی نقل ہے دانتے کے نقشہ (فیگر ۳) کے بازو میں دو چھوٹے نقشے اور نیچے سیڑھی نما نقشے (فیگر ۱-۲-۳) ابن عربی کا تخیلی خاکہ ہے۔ (فتوحات کا نقشہ نمبر ۶ زیر نظر رہے)

نقشہ نمبر ۱۱ (فردوس) ابن عربی اور دانتے کے نقشہ جات فردوس

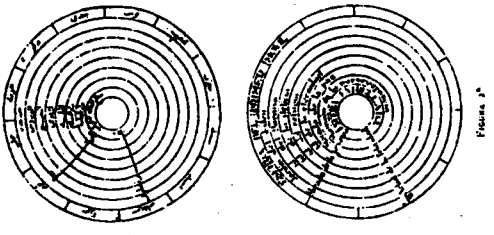

ابن عربی نے احادیث معراج کی روشنی میں فردوس کا نقشہ تیار کیا ہے۔ دانتے نے اسی کی نقل کی ہے۔ اس میں فن و جمال کے عروج کے ساتھ فن اقلیدس کا بھی عروج ہے۔ کائنات دائروں کی سلسلہ وار کڑی ہے۔ جو عالم قدس سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہے (فتوحات کا نقشہ نمبر ۹ ملاحظہ ہو) زمین، پانی، ہوا اور ایتھر کے حلقے سب سے نیچے ہیں۔ (ملاحظہ ہو فتوحات کا نقشہ نمبر ۴) نجومی حلقوں میں چاند مرکری، وینس، آفتاب، مارس، جوپٹر اور سیٹرن بالترتیب ہیں۔ ان کے اوپر غیر متحرک ستاروں یا افلاک کی دنیا ہے۔ اس کے پرے بے ستاروں کی دنیا ہے جہاں عالم نجوم کی سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان سب کے پرے نور ازلی پر عرش اور خدا ہے۔ ابن عربی کے خیال میں جنت غیر متحرک ستاروں اور بلا ستاروں والی دنیا کے درمیان واقع ہے۔ اقلیدس کے اصول پر آٹھ مزید حلقے ہیں مثلاً (۱) سطح فلک الکوکب (۲) دار المقامہ (۳) دار السلام (۴) الخلد (۵) الماویٰ (۶) النعیم (۷) فردوس (۸) جنت عدن جو اصلی جنت ہے۔ (فتوحات کا نقشہ نمبر ۳ ملاحظہ ہو) دانتے نے ان تفصیلات کی نقل کی ہے۔ دانتے کا نقشہ پلاکیوس کے صفحہ ۲۳۳ پر ملاحظہ ہو۔ (ان کی تفصیلات ضمیمہ میں گذر چکی ہیں)۔

نقشہ نمبر ۱۲ (گلاب) ابن عربی اور دانتے کا اقلیدسی فردوس اور گلاب کا پھول

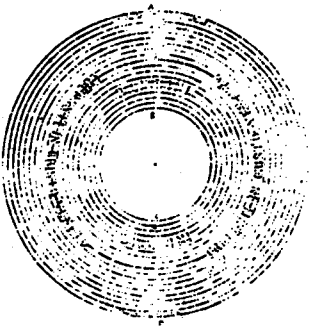

ابن عربی کی فردوس کا آرکی ٹیکچر اقلیدس کے ٹھوس اصولوں پر مبنی ہے۔ بنظر غائر دیکھنے سے یہی نقشہ گلاب کے پھول کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ابن عربی نے بلفظاً پھول کا ذکر نہیں کیا ہے۔ دانتے نے اسی نقشہ کو مسٹک روز (Mystic Rose) کا نام دے دیا ہے۔ پورٹینا نے اپنی کتاب میں گلاب کے پھول کا جو نقشہ بنایا ہے وہ ابن عربی کے فتوحات کے نقشہ سے مماثل ہے (پلاکیوس کا صفحہ ۲۳۴ بھی پیش نظر رہے)

ابن عربی کے خیال میں جنّت ایک عظیم الشان باغ ہے جو سات پرنور یا عکس ریز دائروں میں گھرا ہوا ہے، عدن فردوس کا سب سے عظیم الشان حلقہ ہے جہاں ایک سفید پہاڑی ہے جس کے گرد خدا ترس اور نیکوکار جمع ہو کر دیدار الٰہی کے تصور میں غرق ہو جاتے ہیں۔ یہی تفصیلات معمولی تبدیلیوں کے ساتھ دانتے کے ہاں موجود ہیں۔ دانتے بھی یہی کہتا ہے کہ جنّت کی دیواروں

سے محیط ایک باغ ہے۔ یہ ایک ایسی مملکت ہے جہاں عیسیٰ اور مریم حکمرانی کرتے ہیں۔
یہاں ایک پہاڑی ہے اس کے گرد خدا ترس اور نیکو کار جمع ہو کر حسن ازلی کے دیدار کا تصور کرتے ہیں۔

نقشہ نمبر ۱۳ (دانتے اور اسلامی مصادر کا نصی تقابل)

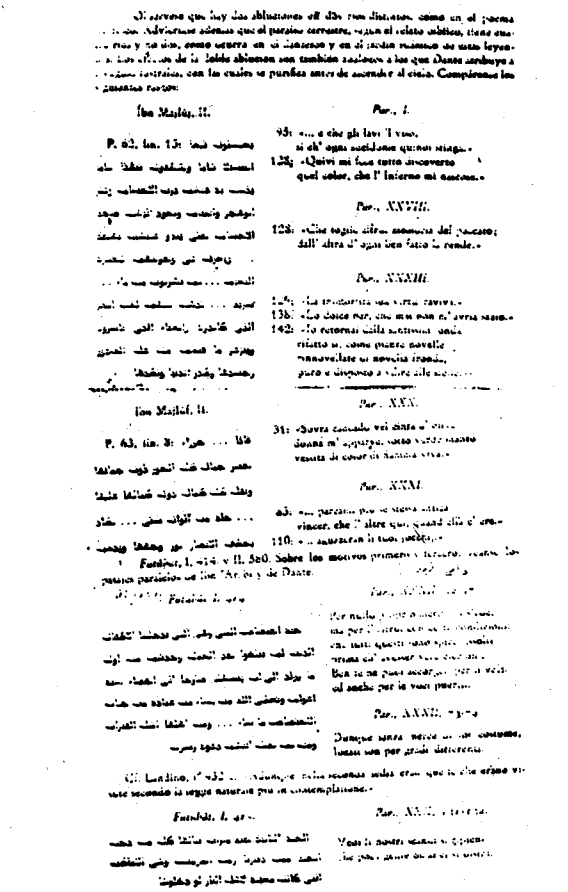

اسلامی مصادر یعنی احادیث معراج اور دانتے کی کمیڈی کے متن میں بھی غیر معمولی مماثلت

پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اعراف کی تخلیق کو لیجیے۔ کینٹو اول میں اشعار ۹۵، ۱۲۸، اور کینٹو ۲۳ میں اشعار ۱۲۹، ۱۳۸ اور ۱۴۲ ملاحظہ ہوں۔ کینٹو ۳۰ میں اشعار ۱۳۱ اور کینٹو میں اشعار ۸۳ اور ۱۱۰ ملاحظہ ہوں۔

نقشہ نمبر ۱۴ دانتے اور ابن عربی کی فردوس کا نصی تقابل

جنت کی تعمیر میں دانتے نے جس طرح ابن عربی کے خیالات کو اپنایا ہے اس کی حرف بحرف مثال ملاحظہ ہو۔

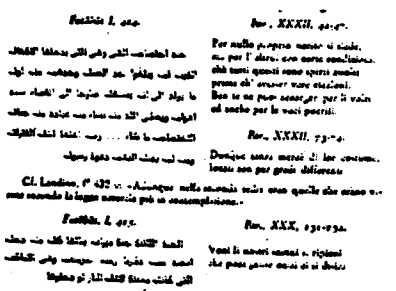

وجود باری تعالیٰ کے اثبات کے لیے ابن عربی نے ہمیشہ اقلیدس کی مدد لی ہے۔ موصوف کے خیال میں عدا مرکزی دائرہ میں نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے موجودات کا ظہور ہوا یہی دائرے، دائرہ در دائرہ میں تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔ اس طرح وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا فلسفہ ثابت ہو جاتا ہے۔ حضرۃ القدس کے مرکزی نقطہ کے ہر چہار طرف پانی مٹی، زندگی کے دائرے ہیں۔ فتوحات میں ابن عربی کے دائروں کا زلف ملاحظہ ہو حضرۃ القدس اور موجودات کا مظہر ہے۔

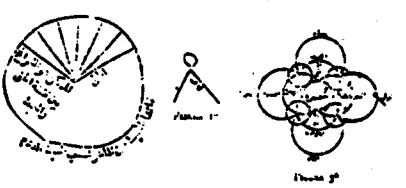

دانتے نے انھیں دائروں کو اپنایا اور فلسفہ تثلیث کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔

مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی الندوی

حضرت عبداللہ بن رواحہ

میدانِ عشق و جہاد کے شہسوار

یثرب، جائے وقوع اور وہاں کے باشندے

جزیرہ نمائے عرب میں نجد و تہامہ کے درمیان پہاڑیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جغرافیہ عرب کے مورخین اس کو 'حجاز' کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں۔ حجاز کے اس خطے میں تین شہروں کو زمانۂ قدیم سے مرکزیت حاصل رہی ہے۔ سب سے مشہور شہر مکہ ہے، اس شہر کو بلد امین کے آسمانی لقب سے نوازا گیا۔ دوسرا مشہور شہر 'یثرب' تھا، اور تیسرا 'طائف'۔ یثرب کو بعد میں 'دار الہجرۃ' بننے کا شرف حاصل ہوا، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرنے کے بعد اس کا نام 'مدینۃ الرسول' پڑ گیا، اور اخیر میں 'المدینۃ المنورۃ' کے پاکیزہ اور روح پرور نام سے مشہور ہوا۔

یثرب کی قدیم آبادی یہودیوں کے قبائل پر مشتمل تھی، یہ لوگ گردشِ زمانہ کا شکار ہو کر مختلف اطراف سے آ کر یثرب میں بس گئے تھے، اور سد مأرب کے انہدام کے بعد یمن سے عرب قبائل ہجرت کر کے یثرب آ گئے۔ اُن میں بنو قیلہ سرفہرست تھے، پھر یہی لوگ اوس و خزرج کے قبیلوں میں منقسم ہو گئے۔ ان کا نسب نامہ ازد قحطان کے قبائل سے ملتا ہے، امتدادِ زمانہ کے ساتھ یہ لوگ یثرب کی اجتماعی زندگی پر چھا گئے، اور یہودیوں کے مقابل میں ان کو بالادستی حاصل ہوئی، اور ان کا شمار یثرب کے شرفاء اور سادات

میں ہونے لگا، زراعت وتجارت ان کا اصل مشغلہ تھا، لیکن خزرج کے لوگ ان میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت کے مالک تھے اور اوس کی بہ نسبت ان کو عددی اور معاشی حیثیت سے بھی غلبہ حاصل تھا، ان کے علاوہ دوسری عرب آبادی کو وہاں کی سوسائٹی میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں تھا۔

اوس وخزرج کا اختلاف

اہل خزرج کی طاقت، ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور لیڈرشپ اور زندگی کے معاملات میں ان کا گہرا اثر قبیلۂ اوس کے لوگوں کے لئے ناقابل برداشت ہوگیا، سب سے بڑھ کر یہ کہ خزرجیوں نے یثرب کے مرکزی علاقہ کو اپنا مرکز ومسکن بنالیا، اور قبیلۂ اوس کے لوگوں کو وہاں سے ہٹ کر جنوب ومشرق میں آباد ہونا پڑا، یہ باتیں زیادہ دنوں تک آپس کے تعلقات کو خوشگوار نہ رکھ سکیں، خصوصاً ایک جنگجو اور باحمیت قوم کے لئے محکوم وتابع بن کر رہنا ناممکن تھا، خزرج کے قبیلہ میں بہت سے جوشیلے نوجوان اور میدان جنگ کے تجربہ کار سن رسیدہ بھی موجود تھے، انھوں نے اس صورتحال پر قناعت کرنا اپنی بڑی توہین سمجھی، اور آخر کار دونوں قبیلوں میں جنگ کی نوبت آگئی اور عرصۂ دراز تک اس کا سلسلہ جاری رہا، ان لڑائیوں میں خون خرابہ اور جان ومال کا ضیاع ناقابل قیاس حد تک ہوا، ان لڑائیوں کی داستان اور ان میں مشہور معرکے کا ذکر آج بھی تاریخ کے صفحات میں پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے، خاص طور سے، یوم سمیر، یوم السرارۃ، یوم کعب، یوم قارع یوم معبس ومضرس اور یوم بعاث، تاریخی حیثیت سے بہت مشہور ہے۔

ان لڑائیوں کے شعلے کو ہوا دینے میں یثرب کے یہودیوں کا بڑا ہاتھ تھا، وہ چونکہ کمزور اور بے اثر تھے اس لئے ان کی عین خواہش تھی کہ یہ عرب آپس میں لڑ کر فنا یا کمزور ہوجائیں، تاکہ ان کو وہاں کے ماحول پر اثر انداز ہونے اور لیڈری کے مواقع حاصل ہوجائیں۔ چنانچہ ان کو اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی، اور قریب تھا کہ

وہی لوگ حاکمانہ حیثیت اختیار کر لیتے اور عربوں کو اپنا غلام بنا کر ان سے بیگار لینے لگتے، لیکن ان کی اس خواہش و کوشش کو اوس و خزرج کے لوگ اچھی طرح سمجھ گئے، اور ان کو اپنی کمزوری اور انتشار کا شدید احساس ہوا، ان کی نظریں ایک قائد کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومنے لگیں، اور وہ اپنے کھوئے ہوئے وقار اور ضائع شدہ طاقت کو بحال کرنے کی فکر میں سرگرداں تھے کہ حج کا زمانہ قریب آگیا اور خزرج کا ایک موقر وفد ادائیگی حج کے خیال سے مکہ روانہ ہوا، جہاں ان کی ملاقات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مقام منیٰ میں ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا پُرجوش استقبال کیا، ان کے حالات معلوم کئے اور ان کو اسلام کی دعوت دی، انھوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا، اور ایسا محسوس کیا کہ ان کو جس چیز کی تلاش تھی وہ مل گئی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنا تاثر اس طرح ظاہر کیا: "ہم اپنی قوم کو دشمنی کی اس حالت میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ ایسی دشمنی کسی اور قوم میں نہیں ہوگی، اب ہم کو یقین ہے کہ ہم متحد ہو جائیں گے، اور اپنی کھوئی ہوئی طاقت و عزت کو واپس لا سکیں گے"۔ پھر ان کے ذریعہ یثرب میں اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خوب تعارف ہوا اور گھر گھر اس کا چرچا ہوا اور لوگ مسلمان ہوئے۔

عبداللہ بن رواحہ اسلام سے پہلے

عبداللہ بن رواحہ بن ثعلبہ، قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے تھے، ان کی والدہ کبشہ بنت واقد بھی خزرجی تھیں، اوس و خزرج کے درمیان طویل جنگی حالات کی وجہ سے دونوں قبیلوں نے اپنے اپنے دفاع کے لئے شعر و شاعری کو بھی بڑی اہمیت دی، دور جاہلیت کی سب سے بڑی خصوصیت شاعری تھی، اس کا استعمال موقع و مناسبت کے لحاظ سے ہر قبیلہ کے لوگ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جس قبیلہ میں کوئی شاعر نہ ہوتا وہ ایک بہت بڑی دفاعی طاقت سے محروم سمجھا جاتا تھا، اور اس کو کسی نہ کسی انداز سے اپنے دفاع کا انتظام کرنا پڑتا تھا، اوس و خزرج کی طویل جنگوں نے دونوں قبیلوں میں شعر و شاعری کو اُبھرنے کا خوب موقع دیا، شاعروں کی حوصلہ افزائی ہوئی، اور وہ پروان چڑھے، چنانچہ حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور عبداللہ

بن رواحہ قبیلہ خزرج کے نہایت زبردست شاعروں میں تھے، اسی طرح اوس کے سب سے بڑے معاصر شاعر قیس بن الخطیم تھے، ان شاعروں کے مشہور اور مقبول قصیدے 'مذھبات' یعنی سنہرے قصائد کے نام سے مشہور تھے۔

اوس و خزرج کے درمیان جاری رہنے والی طویل جنگوں میں دونوں طرف کے شعراء نے شاعری کے اپنے اپنے جوہر دکھائے، اس سلسلہ کی سب سے پہلی جنگ 'سمیر کی لڑائی تھی' اس جنگ کے شعلے کو قبیلۂ اوس کے ایک شخص سمیر بن یزید نے بھڑکایا تھا، اور باوجود ساری کوششوں کے کسی طرح لڑائی کی آگ نہ بجھی اور دونوں طرف کے شاعروں نے دل کھول کر اس میں حصہ لیا۔

عبداللہ بن رواحہ، اور قبائلی جنگوں میں ان کا شاعرانہ کردار

جنگ سمیر زمانی اور مکانی رقبے کے اعتبار سے کافی طویل ثابت ہوئی۔ اس جنگ میں دونوں طرف کے شاعروں کو خوب خوب اپنے جذبات کی عکاسی کا موقع ملا، اوس کا پہلو اس میں غالب تھا۔ چنانچہ اوسی شاعر قیس بن الخطیم نے فخریہ قصیدہ کہا اور خزرج والوں کو ان کی پسپائی پر عار دلایا، اور مقام فضاء میں ہونے والی اس جنگ کا حوالہ دیتے ہوئے اس نے خاص طور سے اس مفہوم پر زور دیا اور کہا کہ:

> "اے بنی عوف کے لوگو! ہم نے مقام فضاء میں تم کو موت کے پیالے پینے پر مجبور کیا، بہادروں کی فوج سے ہم نے تمہارا مقابلہ کیا، اور ہماری تلواروں نے تم کو کسی کام کا نہ رکھا۔ سُن لو! ہم جب تک زندہ رہیں گے تمھیں قتل کرتے رہیں گے اور تمہارے آدمیوں کو غلام بنا کر لے جائیں گے۔"

اس جارحانہ قصیدے کا سُننا تھا کہ عبداللہ بن رواحہ کی رگ حمیت پھڑک اٹھی، اور وہ ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا، چنانچہ انھوں نے قیس بن الخطیم کو ترکی بہ ترکی برجستہ جواب دیا، اور ۲۳ اشعار پر مشتمل اپنا مشہور قصیدۂ دالیہ کہا، اور ابن الخطیم کی ہر ہر بات کا رد کیا اور اس کی خوب خبر لی۔ یہی وجہ ہے کہ ابن الخطیم کے ۱۸ اشعار پر مشتمل قصیدہ کے

جواب میں عبداللہ بن رواحہ کا قصیدہ، ۲۳ اشعار پر مشتمل ہے۔

جنگ بقیع کے موقع پر جب اوس کے لوگوں کو فتح حاصل ہوئی تو اس موقع پر اوسی شاعر عبید بن ناقد الاوسی نے ایک قصیدہ کہا، اور اپنے قبیلے کی تعریف کی، فتح یابی پر مسرور ہوا اور خزرج کے لوگوں کو شرم دلائی، اس موقع پر بھی عبداللہ بن رواحہ نے جوابی قصیدہ پیش کیا، یہ قصیدہ مکمل طور پر محفوظ نہیں، صرف یہ دو شعر تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں:

لما رأیت بنی عوف واخوتھم کعبا، وجمع بنی النجار قد حفلوا
قدما أباحوا بالسیوف ولم یفعل بکم أحد مثل الذی فعلوا

معبس ومضرس اور جنگ بعاث میں

معبس ومضرس دو دیواروں کے نام ہیں، دیوار مضرس کی اوٹ میں قبیلہ خزرج کی فوج تھی اور دیوار معبس کے پیچھے اوسی فوج اپنے جوہر دکھا رہی تھی، یہ لڑائی بہت سخت تھی اور مسلسل کئی دنوں تک بلا کسی توقف کے جاری رہی، اس موقع پر دونوں قبیلوں کے شاعروں نے پوری طاقت کے ساتھ اپنے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ حضرت حسان بن ثابت نے بھی اپنا مشہور نونیہ قصیدہ کہا، ادھر قیس بن الخطیم نے اپنی قوم کی شکست سے متاثر ہو کر نہایت درد و کرب میں ڈوبا ہوا قصیدہ کہا، عبداللہ بن رواحہ نے بھی اس موقع پر شعر کہا، اور ابن الخطیم کو شرم دلائی۔

اسی طرح جنگ بعاث کے موقع پر عبداللہ بن رواحہ نے اثر میں ڈوبی ہوئی شاعری سے دلوں کو گرمایا، اور اپنے حریف شاعر قیس بن الخطیم کو ملامت کرنے اور عار دلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، ان کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کرنے کی اجازت دیجئے، اس میں انھوں نے ابن الخطیم اور قبیلۂ اوس کی کمزوریاں گنائی ہیں:

یاقیس انتم شرار قومکم قدما، وانتم أغثهم نسبا

"اے قیس! تم قدیم زمانہ سے اپنی قوم کے سب سے شر پسند لوگ ہو، اور خاندانی اعتبار سے بھی بہت پست ہو۔"

حالفتم الفحش والخیانة وا لبخل جمیعًا، واللؤم والکذبا

"تم نے کن کن علتوں کو اپنے اندر پال نہیں رکھا ہے، فحش، خیانت، بخل، کمینگی اور جھوٹ، کون سی خصلت تمھارے اندر نہیں ہے۔"

یاقیس ان الأسلاب أحرزها من کان یغشی الذوائب القضبا

"قیس! تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مال غنیمت انھیں لوگوں نے حاصل کیا جو بلند چوٹیوں اور بلند شاخوں پر ٹھکانا لینے والے تھے۔"

وانت فی الدار غیر محتضر حربا، وتدعو قتالنا لعبا

"اور تم اپنے گھر میں بیٹھے جنگ کے لئے کسی طرح تیار نہ تھے اور ہم سے لڑنے کو تم کھیل سمجھ رہے تھے۔"

لوکنت فیهم والحرب لاحقة لکنت فیهم مغلبا ذنبا

"اگر تم ان میں اس وقت ہوتے جب کہ لڑائی اپنے شباب پر تھی، تو تم مغلوب اور دم چھلے ہی بن کر دکھائی دیتے۔"

نحن استبحنا ما فی دیارکم یوم صبحناکم بها حصبا

"ہم نے تمھارے گھروں پر طاقتور حملہ کرکے ہر چیز کو اپنے لئے مباح بنالیا۔"

نحن حماة الآطام فی سألف الد هر، وقد ماسقناکم جنبا

"ہم لوگ قدیم زمانے سے قلعوں کے محافظ ہیں اور اسی وقت سے تم کو ہم غلاموں کی طرح ہانکتے رہے ہیں۔"

عبداللہ بن رواحہ کا قبول اسلام

منیٰ میں ایام حج کے اندر ہجرت کے واقعہ سے قبل بیعۃ العقبہ سے پہلے ہی قبول اسلام

سے مشرف ہوئے پھر بیعت عقبہ میں شریک ہوئے، اس میں مدینہ کے بارہ سرداروں نے اسلام قبول کیا تھا، ان میں بنی حارث بن خزرج کے سردار عبداللہ بن رواحہ تھے۔ ان سرداران قوم کے اسلام قبول کر لینے کے بعد مدینہ کے ہر گھر میں اسلام پہونچ گیا، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ سے عقیدت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو گئی، اب فضا ہجرت کے لئے بالکل ہموار ہو چکی تھی اور آپ نے ہجرت فرمائی، اور مقام قبا میں بنی عمرو بن عوف کے قبیلہ میں قیام فرمایا اور وہیں مسجد قبا کی بنیاد ڈالی۔

ابن عبدالبر نے اپنی کتاب (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب) میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن رواحہ اپنے عصر کے بہترین شاعروں میں شمار ہوتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر کفار کی طرف سے ہونے والے حملوں کا جواب دیتے تھے۔ تاریخ کی شہادت کی روشنی میں ابن رواحہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی طرف سے دفاع کرنے اور جواب دینے میں ایک مثال قائم کر دی، کفار و مشرکین کو ان کی حرکتوں کا منہ توڑ جواب دیتے تھے، خاص طور سے ان کے شاعروں کو لاجواب کر دیتے تھے اور ان کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا، اس معاملہ میں پیش پیش حسان بن ثابت، عبداللہ بن رواحہ اور کعب بن مالک تھے، لیکن عبداللہ بن رواحہ ان کو کفر پر عار دلاتے تھے اور اس کی شناعت بیان کرتے تھے، اور اسلام کی فضیلت اور برتری کا اظہار کرتے تھے، یہ بات ان کے لئے اس وقت تو کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی، لیکن جب وہ لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے تب ان کو ابن رواحہ کے اشعار کی اہمیت معلوم ہوئی۔

ابن رواحہ اور ان کی بدیہہ گوئی

برجستہ گوئی اور حاضر دماغی میں بہت شہرت رکھتے تھے۔ ہشام بن عروہ اپنے والد عروہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن رواحہ سے بڑھ کر کسی کو شعر گوئی کے معاملہ میں جری اور زود گو نہیں پایا۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ ابن رواحہ کوئی ایسا شعر کہو جو اس وقت کے مناسب ہو، اس طرح کہ میں تم کو دیکھتا رہوں، یہ کہنا تھا کہ

وہ کھڑے ہو گئے اور شعر کہنے لگے :

انی تفرست فیك الخیر اعرفه والله یعلم أن ما خانني البصر

"میں نے آپ کے اندر خیر کو اپنی فراست سے دیکھ لیا، اور اس کو میں دیکھ رہا ہوں، خدا شاہد ہے کہ میری نظر نے خیانت نہیں کی۔"

انت النبي ومن یحرم شفاعته یوم الحساب لقد أزری به القدر

"آپ ہی نبی ہیں، اور جو بھی آپ کی شفاعت سے قیامت کے دن محروم رہ جائیگا اس کی قسمت پھوٹ جائے گی۔"

فثبت الله ما اعطاك من حسن تثبیت موسیٰ ونصرًا کالذی نصروا

"اللہ تعالیٰ نے جو خوبیاں آپ کو عطا فرمائی ہیں ان میں وہ آپ کو ثابت قدم رکھے جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو ثابت قدم رکھا، اور آپ کو اپنی مدد اور کامیابی سے نوازے جس طرح اور انبیائے کرام کو مدد اور کامیابی حاصل ہوئی۔"

یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ابن رواحہ! اللہ تعالیٰ تم کو بھی ثابت قدم رکھے۔

ہشام بن عروہ فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی اور عبداللہ بن رواحہ کو ایسی ثابت قدمی عطا فرمائی کہ وہ نعمت شہادت سے سرفراز ہوئے، ان کے لئے جنت کے دروازے کھول دئے گئے اور وہ اس میں داخل ہوئے۔

طبقات فحول الشعراء کے مصنف ابن سلام الجمحی ابن رواحہ کی شاعری اور ان کی سرداری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

"عبداللہ بن رواحہ اپنی قوم کے عظیم المرتبت سردار تھے، جاہلیت میں بھی وہ اسی منصب پر قائم تھے اور ان سے بڑھ کر کوئی سردار نہیں تھا۔ اسلام لائے تو جنگ بدر جیسی عظیم الشان اور فیصلہ کن لڑائی میں شریک ہوئے۔ دور جاہلیت کی جنگوں میں اوسی شاعر قیس بن خطیم سے شاعری کے میدان میں وہ زوردار ٹکر لیتے تھے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مدحیہ اشعار

علامہ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب 'الاصابہ' میں عبداللہ بن رواحہ کے مدحیہ اشعار نقل کیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ شعر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں بہت عمدہ اور بامعنی ہے:

لو لم تکن فیک آیات مبینۃ کانت بدیھتہ تنبیک بالخبر

"اگر رسول خدا کے اندر نبوت کی بالکل کھلی ہوئی نشانیاں نہ بھی ہوتیں تب بھی آپ کے ظاہری حال سے نبوت کی شہادت تم کو مل سکتی ہے۔"

صلح حدیبیہ کے بعد جب عمرۃ القضاء کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو ابن رواحہ آپ کی اونٹنی کی نکیل تھامے ہوئے تھے۔ اہل مکہ کی بھیڑ اس منظر کو دیکھنے کے لئے جمع ہو گئی تھی، اس وقت وہ یہ اشعار پڑھ رہے تھے:

خلوا بنی الکفار عن سبیلہ خلوا، فکل الخیر فی رسولہ

"کافروں کی اولاد! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ صاف کرو، اور ہٹو، تم کو کیا معلوم کہ کونسا خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔"

قد انزل الرحمٰن فی تنزیلہ فی صحف تتلی علیٰ رسولہ

"اللہ تعالیٰ نے اپنی نازل کردہ کتاب میں اور ان صحیفوں میں جو اللہ کے رسول پر تلاوت کئے جاتے ہیں، یہ بات لکھ دی ہے۔"

بأن خیر القتل فی سبیلہ یارب انی مومن بقیلہ

کہ بہترین موت اللہ کے راستے میں ہے، اللہ رب کریم، میں آپ کے فرمانِ برحق پر پوری طرح ایمان رکھتا ہوں۔"

اعرف حق اللہ فی قبولہ نحن ضربناکم علیٰ تأویلہ

میں اللہ کے حق کو خوب پہچانتا ہوں اس کی قبولیت میں، ہم نے تم کو ضرب لگائی اے کافرو! خواب کی تعبیر پر۔"

نحن ضربنا کم علی تاویلہ کما ضربنا کم علیٰ تنزیلہ

"ہم نے تم کو آج اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کی بنیاد پر ضرب لگائی، جس طرح ہم نے تم کو کتاب کے نزول کے وقت ضرب لگائی تھی۔"

اس میں اشارہ سورہ فتح کی آیت "لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین... الخ کی طرف ہے جس میں مسجد حرام میں داخلہ کی بشارت دی گئی ہے۔

ضربًا یزیل الھام عن مقیلہ ویذھل الخلیل عن خلیلہ

"ہم نے تم کو ایسی ضرب لگائی جو کھوپڑی کو سر سے جدا کر دے، اور جو دوست کو اپنے دوست سے غافل بنا دے۔"

او یرجع الحق الیٰ سبیلہ

"تا آنکہ حق اپنے راستے پر واپس نہ آجائے۔"

نعتیہ قصیدہ

اس قصیدہ کے چند بند اوپر گذر چکے ہیں، بقیہ اشعار مع ترجمہ کے پیش کئے جاتے ہیں:

یا آل ھاشم ان اللہ فضلکم علی البریۃ فضلا مالہ غیر

"اے آل ہاشم! اللہ تعالیٰ نے آپ کو پوری مخلوق پر فضیلت عطا فرمائی ہے، اور اس برتری اور بلندی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔"

ولو سألت أو استنصرت بعضھم فی جل امرک ما آووا ومانصروا

"اور اگر آپ ان اہل قریش اور بنی عمرو بن مخزوم سے اپنے کسی معاملہ میں کوئی مدد چاہتے، تو وہ نہ آپ کو ٹھکانہ دیتے اور نہ کوئی مدد کرتے۔"

فخبرونی أثمان العباء متی کنتم بطاریق اودانت لکم مضر

"مجھے بتاؤ اے دو کوڑی کے لوگو! تم کب فنون حرب کے ماہر و قائد تھے، یا کب قبیلۂ مضر نے تم کو سردار تسلیم کیا تھا۔"

ابن رواحہ نے جب یہ شعر پڑھا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر ناگواری

کا اثر ظاہر ہوا، اس لئے کہ اہل قریش پر اس میں طنز تھا، وہ خود بیان کرتے ہیں کہ جب میں نے یہ صورت حال دیکھی تو فوراً یہ شعر میری زبان سے نکلا :

نجالد الناس عن عرض فنأسرهم فينا النبي وفينا تنزل السور

"ہم دشمنوں کا مقابلہ ایک کنارے سے تلواروں سے کرتے ہیں اور پھر ہم ان کو گرفتار کر کے قیدی بنا لیتے ہیں، اللہ کے نبی ہمارے ساتھ ہیں، اور ہمارے درمیان قرآن کی سورتیں نازل ہوتی ہیں۔"

وقد علمتم بأنا ليس يغلبنا حي من الناس ان عزوا وان كثروا

"تم کو معلوم ہو چکا ہے کہ کوئی قبیلہ ہم پر غالب نہیں آپاتا، خواہ وہ کتنا ہی باعزت ہو اور اس کے افراد کی طاقت و تعداد کتنی ہی زیادہ ہو۔"

غزوۂ خندق کے موقع پر رجزیہ کلام

۵ھ میں غزوۂ خندق کی تیاری ہو رہی تھی، صحابۂ کرام کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی خندق کھودنے میں مشغول تھے، خندق کے ہر چہار جانب آپ نے لوگوں کو متعین فرما دیا تھا، اور نہایت سرگرمی کے ساتھ یہ کام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی میں انجام پا رہا تھا، عبد اللہ ابن رواحہ بھی پوری توجہ اور سرگرمی کے ساتھ اس کام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس موقعہ پر ابن رواحہ نے ایک رجزیہ کلام لوگوں کی ہمت بڑھانے کے لئے کہا، وہی مسلمانوں کا ترانہ بن گیا۔ وہ خندق کھودتے جاتے تھے اور رجز پڑھتے جاتے تھے، خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بہت پسند فرمایا، اور خندق میں حصہ لیتے وقت آپ نے بھی اس کو بار بار دُہرایا اور پڑھا، وہ رجزیہ ہے :

اللهم لولا انت ما اهتدينا ولا تصدقنا ولا صلينا

فأنزلن سكينة علينا وثبت الأقدام إن لاقينا

إن الألى قد بغوا علينا وإن ارادوا فتنة ابينا

اور کبھی یہ پڑھتے :

هذا الحمال لاحمال خيبر هذا أبرّ ربنا واطهر

ادھر مہاجرین وانصار خندق کھودتے اور اپنی پیٹھ پر مٹی لاد کر اسے منتقل کرتے وقت شوق وارفتگی کے عالم میں یہ رجز پڑھتے :

نحن الذين بايعوا محمدًا على الجهاد ما بقينا ابدًا

دوسری طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو یہ جواب دیتے :

اللّٰهم لاخير إلاخير الآخرة فبارك في الانصار والمهاجرة

مسجد قبا کی تعمیر کے موقع پر

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے جب مدینہ منورہ پہونچے تو پہلے مدینہ سے باہر قبا بستی میں عمرو بن عوف کے قبیلہ میں قیام فرمایا، آپؐ نے اپنے دوران قیام وہاں مسجد قبا کی بنیاد رکھی، اور مسلمانوں نے نہایت ذوق وشوق سے اس کی تعمیر کا کام شروع کر دیا، اس موقع پر عبداللہ بن رواحہ نے یہ رجز موزوں کیا، اور مسلمانوں کی ہمت افزائی کے لئے اسے پڑھنا شروع کیا :

أفلح من يعالج المساجدا ويقرأ القرآن قائمًا وقاعدًا

ولايبيت الليل عنه راقدا ومن يُرى عن الغبار حائدا

"ان لوگوں کی کامیابی میں کیا شبہ ہے جو مسجدوں کی تعمیر میں اور اٹھتے بیٹھتے قرآن کی تلاوت میں لگے ہوئے ہیں اور وہ سو کر اپنی راتیں نہیں گذارتے بلکہ جس کو دیکھئے غبار میں اٹا ہوا ہے۔"

اس رجز کی خوبی یہ ہے کہ اسے ابن رواحہ پڑھتے جاتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ہر بند کے قافیے کو دُہراتے جاتے تھے۔

نعتیہ اشعار کے کچھ بند :

عبداللہ بن رواحہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت درجہ تعلق تھا،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان سے بہت محبت فرماتے تھے۔ان کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ تلوار اور زبان دونوں کے بیک وقت مرد میداں تھے، شوق جہاد سے سرشار تھے اور جب بھی کوئی موقع ہوتا حضور کی شان میں شعر کہتے، وہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے وحی اور دوسری تحریریں لکھواتے تھے، سفروں اور غزوات میں ساتھ رہتے۔ایک دفعہ انھوں نے یہ مدحیہ شعر کہے:

یارسول المليك ان لسانی راتق مافتقت اذ أنا بور

"اے اللہ کے رسول بلاشبہ میری زبان بند ہے، میں اسے کھول نہیں سکا، اس لئے کہ میں ہلاک ہونے والوں کی صف میں ہوں۔"

عمرۃ القضا کے موقع پر ابن رواحہ کا یہ رجز بھی منقول ہے:

بسم الذی لادین الادینه بسم الذی محمد رسوله

انا الشهيد انه رسوله

افک کے واقعہ سے متاثر ہو کر یہ اشعار کہے تھے، یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منقبت میں ہے:

تعاطوا برجم الغيب زوج نبيهم ومخطة ذی العرش الكريم فأترجوا

"بغیر تحقیق کے ان لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ کی شان میں بہتان تراشی کی اور انھوں نے عرش والے رب کی ناراضگی مول لی، اور اس کی وجہ سے غم واندوہ میں مبتلا ہوئے۔"

وآذوا رسول الله فيها فجللوا مخازی تبقی، عمموها وفضحوا

وصبت عليهم محصدات كأنها شآبيب قطر من ذرا المزن تسفح

"اور ان لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ کی شان میں تکلیف پہونچائی، تو وہ ہمیشہ باقی رہنے والی رسوائیوں پر سوار کئے گئے اور اس میں پوری طرح وہ مبتلا کئے گئے اور رسوا کئے گئے۔

ان پر غضب الٰہی کے کوڑے برسائے گئے، جس طرح آسمان سے

تیز بارش برستی ہے۔"

دوسرے مواقع کے نعتیہ اشعار

عبداللہ بن رواحہ کی اہلیہ کو ان سے کچھ شکایت پیدا ہوئی، اس کے ازالہ کے سلسلہ میں ان کا مطالبہ ہوا کہ ابن رواحہ اگر اپنی بات میں سچے ہیں تو قرآن پڑھ کر سنائیں مگر وہ موقع ایسا تھا کہ قرآن پڑھنا مناسب نہیں تھا، البتہ اہلیہ صاحبہ کو مطمئن کرنے کے لئے انھوں نے یہ اشعار قرآن کی طرح پڑھ دئے، چونکہ وہ بہت زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں اس لئے مطمئن ہوگئیں اور ان اشعار کو آیات قرآنی تصور کرلیا۔

وفینا رسول اللہ یتلوا کتابہ اذا انشق معروف من الصبح ساطع

"ہمارے درمیان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں وہ صبح کے طلوع ہونے کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔"

أرانا الھدی بعد العمی فقلوبنا بہ موقنات أن ما قال واقع

"گمراہی کے بعد ہم کو انھوں نے ہدایت کا راستہ دکھایا تو ہمارے دل اس بات پر بالکل مطمئن ہیں کہ آپ کا فرمان بالکل سچ ہے اور حقیقت پر مبنی ہے۔"

یبیت یجافی جنبہ عن فراشہ اذا استثقلت بالکافرین المضاجع

"اس طرح رات گذارتے ہیں کہ آپ کا پہلو آپ کے بستر سے الگ رہتا ہے ایسے وقت میں جب کہ کفار نیند کے متوالے ہوتے ہیں۔"

واعلم علما لیس بالظن أننی إلی اللہ محشور ھناک و راجع

"میں یقین کامل رکھتا ہوں اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہونا ہے اور آخرت کی طرف لوٹنا ہے۔"

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس موقع پر انھوں نے مندرجہ ذیل اشعار کہے تھے:

شھدت باذن اللہ ان محمدًا رسول الذی فوق السماوات من عل

"اللہ کو منظور ہوا تو میں نے شہادت دی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس اللہ کے

رسول ہیں جو تمام آسمانوں کے اوپر ہے۔"

وأن ابا یحیی و یحیی کلیهما له عمل فی دینه متقبل

"ابو یحییٰ یعنی زکریا علیہ السلام اور ان کے فرزند یحییٰ علیہ السلام دونوں ہی کا عمل مقبول ہے آپ کے دین میں (یعنی وہ بھی آپ ہی کے دین کے متبع تھے)۔"

وأن التی بالجزع من بطن نخلة ومن دانها فلٌّ من الخیر معزلُ

"اور عُزّیٰ درخت جو وادیٔ نخلہ میں طائف اور مکہ کے درمیان ہے اور جس کی لوگ عبادت کرتے ہیں، وہ ہر طرح کے فائدے اور خیر سے بالکل خالی ہے۔"

وان الذی عادی الیهود ابن مریم رسول أتی من عند ذی العرش مرسلُ

"اور جنھوں نے یہود سے دشمنی کی وہ ابن مریم ہیں، عرش والے اللہ کے بھیجے ہوئے وہ رسول مرسل ہیں۔"

وأن أخا الاحقاف إذ یعذلونه یجاهد فی ذات الاله ویعدل

"اور وادیٔ احقاف والے یعنی ہود علیہ السلام کو جب لوگ ملامت کرتے تھے تو وہ اللہ کی رضا کے لئے جہاد کرتے تھے اور عدل گستری کا فریضہ انجام دیتے تھے۔"

ایک دوسری روایت میں ہے کہ جن اشعار کو انھوں نے اپنی اہلیہ کو قرآن کی جگہ پڑھا تھا وہ یہ ہیں:

شهدت بأن وعد الله حق وأن النار مثوی الکافرینا

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ برحق ہے اور جہنم کافروں کا ٹھکانا ہے۔"

وأن العرش فوق الماء طاف وفوق العرش رب العالمینا

"اور یہ کہ عرش الٰہی پانی کے اوپر تیر رہا ہے اور عرش کے اوپر رب العالمین ہیں۔"

وتحمله ملائکة کرام ملائکة الإله مقربینا

"اور عرش کو باعزت فرشتوں نے اپنے اوپر اٹھا رکھا ہے، خدا کے

مقرب و محبوب فرشتوں نے "

صرف دو خالص نعتیہ شعر

صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منقبت میں بغیر کسی تقریب یا خاص مناسبت کے یہ دو شعر انھوں نے کہے:

تحمله الناقة الأدماء معتجرًا بالبرد كالبدر جلّى ليلة الظلم

"گندم گوں اونٹنی آپ کو لے کر چل رہی ہے اس حال میں آپ نے چادر کا عمامہ باندھ رکھا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ماہ کامل تاریک راتوں کو منور کر دے "

وفي عِطافيه أو أثناء بردته ما يعلم الله من دين ومن كرم

"آپ کے دونوں جانب کے حصوں میں ہو یا آپ کی چادر کی تہوں میں، ہر جگہ دین و اخلاق کے خزانے چھپے ہوئے ہیں اس پر اللہ شاہد ہے "

ابن تیہان کی ضیافت اور ابن رواحہ کا مدحیہ کلام

ایک رات کا واقعہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھوک کی شدت سے باہر نکلے اور ابو الہیثم ابن تیہان کے گھر تشریف لے گئے۔ انھوں نے زبردست استقبال کیا اور خوشی سے پھولے نہ سمائے، بہترین ضیافت کا انتظام کیا، اس میں عمدہ کھجور، کھانا اور ٹھنڈا پانی خاص طور سے قابل ذکر ہے، حضورؐ نے کھانا تناول کرنے کے بعد فرمایا، واللہ یہی وہ نعمت ہے جس کے بارے میں قیامت کے دن سوال کیا جائے گا۔ اس موقع کی مناسبت سے عبد اللہ بن رواحہ نے مندرجہ ذیل اشعار کہے:

فلم أر كالإسلام عزًا لأمة ولا مثل أضياف الأراشي معشرًا

"کسی امت کے شرف و عزت کے لئے اسلام جیسا مذہب میں نے نہیں پایا،

اور نہ اراشی (مراد ابن تیہان ہیں جن کی نسبت ان کے جدامجد اراش بن لحیان کی طرف کی گئی ہے) کے مہمانوں جیسی کوئی معزز جماعت میں نے کہیں دیکھی۔"

نبی وصدیق و فاروق أمة وخیر بنی حواء فرعا وعنصرا

"امت کے نبی، صدیق اور فاروق سبھی جمع تھے، اور حوا کی بہترین اولاد اصل و فرع کے لحاظ سے، موجود تھے۔"

فوافوا لمیقات وقدر قضیة وکان قضاء اللہ قدرًا مقدرًا

"یہ لوگ ایک مقررہ وقت اور تقدیر کے فیصلہ کے مطابق وہاں پہونچے، اور اللہ کا فیصلہ ایک اٹل تقدیر ہے۔"

الی رجل نجد یباری بجودہ شموس الضحیٰ جودا ومجدًا ومفخرا

"ایک ایسے بہادر، بلند حوصلہ آدمی کے پاس جو اپنی سخاوت سے دن کے سورج کا مقابلہ کرتا ہے (اور) اپنی عالی ظرفی، بزرگی اور قابل فخر کارناموں سے

وفارس خلق اللہ فی کل غارة اذا لبس القوم الحدید المسمّرا

"جو ہر جنگ کے موقع پر ایک بڑا شہسوار بن کر سامنے آتا ہے، جب دشمن کے لوگ کانٹے دار زرہ اور ہتھیار سے لیس ہوتے ہیں۔"

فقدی وحیّا ثم أدنی قراهم فلم یقرهم الا سمینًا متمرّا

"اس نے اپنے معزز مہمانوں کے لئے جان چھڑک دی، اور خوش آمدید کہا، پھر ان کے لئے مہمانی کا کھانا پیش کیا، اس کھانے میں نہایت تروتازہ اور تندرست بکرے کے گوشت کے ٹکڑے تھے۔"

سیّد الشہداء کی تعزیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عم معظم سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے جنگ احد کے موقع پر جام شہادت نوش فرمایا، دشمنوں نے ان کے ساتھ مثلہ کرنے اور جگر نکال کر چبانے کا جو معاملہ کیا اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو بہت اذیت پہونچی،

اس کا اثر حضور پر ظاہر ہوا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی غمگین ہوئے، اس موقع پر حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے نہایت طاقتور قصیدہ میں تعزیت پیش کی، اور ابن رواحہ نے بھی بے مثال تعزیتی قصیدہ کہا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زخمی دل کو تسلی دینے کی کوشش کی، اور کفار کو ان کی غداری پر ملامت کی اور ان کی بزدلی پر ان کو عار دلائی:

بکت عینی الیسری وحق لها بکاها　　وما یغنی البکاء ولا العویل

"اللہ کے شیر پر میری آنکھیں اشکبار ہوئیں اور ان کو رونے کا پورا حق حاصل ہے، لیکن اب رونے دھونے سے کوئی فائدہ پہونچنے والا نہیں ہے۔"

علی أسد الاله غداة قالوا　　أحمزة ذاکم الرجل الطویل

"اللہ کے شیر پر میری آنکھیں اس صبح کو آنسو بہانے لگیں جب کہا جانے لگا کہ کیا حمزہ وہ بلند قامت انسان دنیا سے جاتا رہا۔"

أصیب المسلمون به جمیعاً　　هناك، وقد اصیب به الرسول

"تمام مسلمانوں کو ان کا سخت صدمہ پہونچا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل زخمی ہوا (خاص طور سے مثلہ کرنے اور جگر چبانے کی وجہ سے)۔"

أبا یعلی لك الارکان هدت　　وانت الماجد البر الوصول

"اے ابو یعلی! ارکان عالم آپ کی موت پر لرز اٹھا، اور آپ ہی وہ شریف نیکوکار اور اپنے مقصد تک پہونچنے والے انسان ہیں۔"

علیك سلام ربك فی جنان　　مخالطها نعیم لا یزول

"جنت کے باغوں میں آپ پر آپ کے رب کی سلامتی ہو جہاں لازوال نعمتیں ہیں۔"

ألا یا هاشم الأخیار صبراً　　فکل فعالکم حسن جمیل

"اے آل ہاشم دنیا کے منتخب ترین لوگو! صبر کرو، اس لئے کہ تمہارے افعال بہتر اور خوبصورت ہیں۔"

رسول الله مصطبر کریم　　بأمر الله ینطق اذ یقول

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہایت صبر کرنے والے صاحب کرم ہیں، وہ اللہ ہی کے حکم سے جو کچھ بولتے ہیں، بولتے ہیں۔"

ألا من مبلغ عنی لویاً فبعد الیوم دائلة تدول

"کون میرا یہ پیغام قریش کو پہونچا دے گا کہ آج کے بعد سے جنگ کا سلسلہ قائم رہے گا۔"

وقبل الیوم ماعرفوا وذاقوا وقائعنا بها یشفی الغلیل

"آج سے پہلے انھوں نے ہماری اُن لڑائیوں کو نہ دیکھا اور نہ ان کا تجربہ کیا ہوگا جن سے ہمارے انتقام کی پیاس بجھائی جائے گی۔"

نسیتم ضربنا بقلیب بدر غداة أتاکم الموت العجیل

"کیا قلیب بدر میں ہماری مار کو تم بھول گئے جہاں صبح تڑکے تم کو ناگہانی موت نے گھیر لیا تھا۔"

غداة ثوی ابوجهل صریعاً علیه الطیر حائمة تجول

"جس صبح کو ابوجہل مارا گیا، اور اس پر پرندے منڈلانے لگے تھے

وعتبة وابنه خرا جمیعاً وشیبة عضه السیف الصقیل

"اور عتبہ اور اس کا بیٹا دونوں منہ کے بل گر کے ہلاک ہوئے تھے اور شیبہ کو چمکدار تلوار نے ہلاک کیا تھا۔"

ومترکنا أمیة مُجْلعباً وفی حیزومه لدن نبیل

"اور امیہ کو ہم نے زمین پر گرا چھوڑا تھا اس حال میں کہ اس کے سینے میں بہت بڑا نیزہ پیوست تھا۔"

وهام بنی ربیعة سائلوها ففی أسیافنا منها فلول

"اور بنی ربیعہ کی کھوپڑیوں سے ذرا پوچھو، جن کی وجہ سے ہماری تلواریں کُند ہو گئی تھیں۔"

ألا یا هند فابکی لاتملی فأنت الواله العبری الهبول

"اے ہند! (جس نے حضرت حمزہؓ کا جگر چبایا تھا) آنسو بہاتی رہو اور گھبراؤ مت، اس لئے کہ دراصل تم ہی رونے والی اور سوگوار ہو۔"

ألا یا هند لا تبدی شماتا بحمزة إن عزکم ذلیل

"خبردار اے ہند! حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی مصیبت پر ذرا بھی خوش نہ ہونا، اس لئے کہ تم جس چیز کو عزت سمجھتی ہو وہی دراصل ذلت ہے۔"

ابوسفیان بن حرب کی وعدہ خلافی کے موقع پر

غزوۂ احد سے شکست کھا کر جاتے ہوئے ابوسفیان بن حرب نے دھمکی دی تھی کہ اس شکست کا بدلہ ہم اگلے سال مقام بدر الصفراء پر آکر لیں گے، اور یہ اعلان کیا تھا کہ سال پورا ہوتے ہی ہم آکر لڑیں گے۔ اس کا جواب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے دیا تھا اور فرمایا تھا کہ بے شک ہم تیار ہیں، لیکن جب سال پورا ہوا اور وعدہ پورا کرنے کا وقت آیا تو ابوسفیان کی رائے بدل گئی، اور اب مسلمانوں سے لڑنے کی ہمت ہار گئے، ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو لے کر مقام موعود پر مقررہ وقت کے اندر پہونچ گئے اور ابوسفیان اور ان کے لشکر کا انتظار کرتے رہے، لیکن وہ نہیں آئے اور وعدہ خلافی کر بیٹھے، اسی موقع پر عبداللہ بن رواحہ نے ابوسفیان کو شرم دلاتے ہوئے اور وعدہ خلافی پر سخت ملامت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار کہے:

وعدنا أبا سفیان بدراً فلم نجد لمیعاده صدقا وما کان وافیا

"مقام بدر الصفراء پر ہم نے ابوسفیان کے کہنے پر ان سے حامی بھر لی تھی مگر افسوس کہ وہ اپنے وعدے کے سچے نہیں نکلے اور نہ وفائے وعدہ کا پاس کیا۔"

فأقسم لو وافیتنا فلقیتنا لأبت ذمیماً وافتقدت الموالیا

"بخدا اگر تم ہم سے آکر ملتے اور جنگ کرتے تو یقین مانو بری حالت میں واپس جاتے اور اپنے حامیوں کو بھی کھو بیٹھتے۔"

ترکنا بہ اوصال عتبۃ وابنہ وعمرًا اباجھل ترکناہ ثاویا

"وہاں ہم عتبہ بن ربیعہ کے ٹکڑے اڑا دیتے اور اس کے بیٹے ولید اور ابوجہل کو ٹھکانے لگا دیتے۔"

عصیتم رسول اللہ أف لدینکم وأمرکم السیئ الذی کان غاویا

"تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی، تُف ہے تمہارے دین اور تمہارے بُرے اور گمراہ کُن اعمال وافعال پر۔"

وإنی وإن عنفتمونی لقائل فدی لرسول اللہ أھلی ومالیا

"مجھے چاہے تم جتنا بھی بُرا بھلا کہو لیکن میں فخر سے کہتا رہوں گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر میرے مال واولاد سب کچھ قربان ہوں۔"

أطعناہ لم نعدلہ فینا بغیرہ شھابا لنا فی ظلمۃ اللیل ھادیا

"ہم نے حضور کی اطاعت کی اور ان کے برابر کسی کو نہیں قرار دیا، وہ ہماری راتوں کے شہاب ثاقب اور ہمارے رہنما ہیں۔"

حضرت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی واپسی کے موقع پر ابن رواحہ کا قصیدہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شادی ابوالعاص ابن الربیع کے ساتھ زمانۂ جاہلیت میں ہوگئی تھی، غزوۂ بدر کے موقع پر جب ابوالعاص کفار مکہ کے ساتھ گرفتار ہوگئے، اس لئے کہ وہ مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے تو حضرت زینب نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی رہائی کی درخواست کی، چنانچہ مسلمانوں نے ان کو اس شرط پر چھوڑ دیا کہ وہ حضرت زینب کو مکہ سے مدینہ واپس کر دیں، ابوالعاص بن الربیع نے اس شرط کو قبول کر لیا اور مکہ واپس آکر حضرت زینب کو ایک ہودج میں سوار کر کے مدینہ واپس بھیج دیا، اس موقع پر عبداللہ بن رواحہ نے یہ قصیدہ کہا:

أتانی الذی لایقدر الناس قدرہ لزینب فیھم من عقوق ومأثم

"مجھے حضرت زینب کے بارے میں ان لوگوں کی طرف سے جو نافرمانیاں اور ناپسندیدہ باتیں ہوئیں وہ معلوم ہوئی ہیں، اس کی اہمیت سب کو نہیں معلوم ہے۔"

وإخراجھا لم یخز فیھا محمد علی مأقط، وبیننا عطر منشم

"ان کو واپس کرنے اور مکہ سے نکالنے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی رسوائی نہیں ہوئی، اُس سخت جنگ کے بعد جو پیش آئی اور جس میں موت کی خوشبو سب نے محسوس کی۔"

وأمسی ابوسفیان من حلف ضمضم ومن حربنا فی رغم أنف ومندم

"ابوسفیان ضمضم بن عمرو کے معاہدے کی وجہ سے اور ہماری ان کے ساتھ جنگ کے باعث سخت ندامت اور ناگواری میں مبتلا ہو گئے۔"

قرنّا ابنہ عمرًا ومولی یمینہ بذی حلق جلد الصلاصل محکم

"ہم نے ان کے بیٹے عمرو اور ان کے حلیف کو حلقوں والی مضبوط اور نہ ٹوٹنے والی زنجیروں میں قید کر دیا ہے۔"

فأقسمت لاتنفک منا کتائبٌ سراۃ خمیس فی لھام مسوّم

"میں نے قسم کھا کر کہا کہ ہم لشکر کے سرداروں کے دستوں کو کبھی چھوڑ نہیں سکتے جن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور جن پر نشان لگا ہوا ہے۔"

نَزوعُ قریش الکفر حتی نعلھا بخاطمۃ فوق الأنوف بمیسم

"ہم کافر قریش کو لگام لگا کر ہانکیں گے تاکہ ان کو دو بار جام ذلّت پلائیں، اور ہم ان کی ناکوں کے اوپر داغ لگائیں گے۔"

ننزّلھم اکناف نجد ونخلۃ وإن یُتھِموا بالخیل والرجل نُتھِم

"ہم ان کو مقام نجد و نخلہ کے اطراف میں پہونچا دیں گے، اور اگر وہ اپنے پیدل اور سوار کے ساتھ تہامہ جانا چاہیں گے تو تہامہ لے جائیں گے۔"

ید الدھر حتی لایعوّج سربُنا ونلحقھم آثار عاد وجرھم

"ہمیشہ کے لئے، تاکہ ہمارا راستہ ٹیڑھا نہ کیا جائے، اور ہم ان کو قوم عاد وجرہم کے آثار سے ملادیں گے، یعنی نیست ونابود کردیں گے۔"

ویندم قوم لم یطیعوا محمدًا علیٰ أمرھم، وأیّ حین تندّم

"جن لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہیں کی اور اپنی بات پر اڑے رہے وہ بہت شرمندہ ہوں گے، لیکن ندامت اس وقت کوئی فائدہ نہیں پہونچائے گی۔"

فأبلغ ابا سفیان إما لقیتہ لئن أنت لم تخلص سجودًا وتسلم

فأبشر بخزی فی الحیاۃ معجّل وسربال قار خالدًا فی جھنم

"ابوسفیان سے ملاقات ہو تو میرا یہ پیغام ان کو پہونچادو، کہ اگر تم نے اپنے رب کے لئے سچے سجدے نہیں کئے اور اسلام نہیں لائے تو بہت جلد پیش آنے والی رسوائی کی بشارت قبول کرو، اور تارکول کے لباس کی، جہنم میں ہمیشہ رہتے ہوئے۔"

جنگ موتہ کے لئے روانگی اور عشقیہ اشعار

عبداللہ ابن رواحہ عقبہ کے علاوہ تمام اہم غزوات میں نہایت ذوق وشوق کیساتھ شریک ہوئے، اور راہ خدا میں جان دینے کا جذبہ ان کے دل میں شدت سے موجزن تھا، وہ غزوۂ بدر، احد، خندق، حدیبیہ اور عمرۃ القضاء، سبھی غزوات میں شریک ہوئے، لیکن غزوۂ موتہ ان کا آخری معرکہ تھا جہاں ان کا شوق شہادت پورا ہونے والا تھا، عروہ بن زبیر فرماتے ہیں کہ جب عبداللہ بن رواحہ موتہ کی طرف روانہ ہونے لگے اور مسلمانوں نے ان کو رخصت کیا تو دعا کی گئی کہ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے ساتھیوں کو فتحمند اور سالم وغانم واپس لائیں، تو یہ سُن کر ابن رواحہ نے یہ شعر پڑھا:

لکننی أسأل الرحمٰن مغفرۃ وضربۃ ذات فرغ تقذف الزبدا

أو طعنۃ بیدی حران مجھزۃ بحربۃ تنفذ الأحشاء والکبدا

حتی یقال إذا مروا علی جدثی ارشدہ اللہ من غاز وقد رشدا

"لیکن میں تو اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا طالب ہوں اور ایسی کاری ضرب کا متمنی ہوں، جس سے جھاگ مارتا ہوا خون ڈول کے منہ کی طرح نکلے۔

یا کسی گرم دشمن کی طرف سے کام تمام کر دینے والا نیزہ لگے جو کلیجے اور جگر کو پار کر جائے۔

یہانتک کہ جب لوگ میری قبر کے پاس سے گذریں تو کہیں کہ کیا ہی خوب مجاہد تھا، جس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔"

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رخصت کیا اور موتہ کی لڑائی پر روانہ فرمادیا تو انھوں نے یہ شعر پڑھا:

خلف السلام علی امری ودعتہ فی النخل خیر مشیع وخلیل

"امن وسلامتی ہمیشہ اس شخص کریم کے پیچھے رہے جن سے میں نخلستان میں ابھی رخصت ہوا، وہ بہترین رہنما اور دوست ہیں۔"

موتہ کے راستے میں وارفتگی اور شعر

عبداللہ بن رواحہ موتہ روانہ ہوئے تو اپنی اونٹنی پر انھوں نے اپنے یتیم بھائی زید بن ارقم کو جو ان کے زیر تربیت تھے اپنے پیچھے بٹھا لیا تھا، انھوں نے رات کے سناٹے میں راستے میں یہ شعر پڑھنا شروع کیا، حضرت زید نے اسے سُنا اور روایت کیا:

إذا أدنیتنی وحملت رحلی مسیرۃ اربع بعد الحِساء[1]

فشأنک فانعمی وخلاک ذم ولا ارجع الی اھلی ورائی

---

[1] حِساء اس پانی کو کہتے ہیں جو ریت میں ہوتا ہے اور جذب ہونے لگتا ہے۔ پھر جب اندر کوئی چٹان اس کو مل جاتی ہے تو وہاں رُک جاتا ہے، لیکن حَساء فتحہ کے ساتھ کھانے پینے کے معنی میں ہے۔

وجاء المومنون وغادرونی بأرض الشام مشهور السواء
وردك كل ذی نسب قریب الی الرحمٰن منقطع الاخاء
هنالك لا أبالی طلع بعل[1] ولا نخل أسافلها رواء

غزوہ موتہ میں جب حضرت زید بن حارثہ اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہما دونوں شہید ہوگئے اور لشکر کی قیادت کا جھنڈا ابن رواحہ کے ہاتھ میں آیا تو ان کے دل میں کچھ گھبراہٹ پیدا ہوئی، اس موقع پر انھوں نے اپنے دل کو سمجھاتے ہوئے اور اس کو مطمئن کرتے ہوئے یہ اشعار کہے اس میں انھوں نے اپنے نفس کو مخاطب کیا ہے:

أقسمت یا نفس لتنزلنه طائعة أولا لتكرهنه
إن اجلب الناس وشدوا الرنة مالی أراك تكرهین الجنة
قد طالما قد كنت مطمئنة هل انت الا نطفة فی شنة
جعفر ما أطیب ریح الجنة

اسی مفہوم کے کچھ اور اشعار بھی رجز کے انداز میں انھوں نے بالارتجال کہا ہے، اس میں بھی اپنے نفس کو مخاطب کیا ہے، اسے سمجھا رہے ہیں اور اللہ کی راہ میں شہید ہونے کے لئے راستہ ہموار کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں:

هل انت الا اصبع دمیت
وفی سبیل الله ما لقیت
یا نفس إلا تقتلی تموتی
هذا حمام الموت قد صلیت
ان تسلمی الیوم فلن تفوتی
أو تبتلی فطالما عوفیت

---

[1] کھجور کا درخت جس کی جڑیں اندر تک پھیلی ہوئی ہوں اور اس کو سینچنے کی ضرورت نہ پڑتی ہو۔

وما تمنیتِ فقد اُعطیت
إن تفعلی فعلھما[1] ھُدیت

وإن تأخرت فقد شقیتِ

یہ ہیں حضرت عبداللہ بن رواحہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی، اور میدان شعر و جہاد کے شہسوار، اسلام سے قبل دور جاہلیت میں اوس و خزرج کی طویل جنگوں میں اُلجھ جانے اور فتح و کامیابی کی فکروں میں مشغول رہنے کی وجہ سے شعر گوئی میں بہت زیادہ حصہ نہ لے سکے، اسلام قبول کرنے کے بعد اسلامی جہاد اور غزوات میں برابر شریک رہے اور اہم مواقع پر مشق سخن سے بھی غافل نہیں رہے، لیکن کم گو شاعر کی حیثیت سے تاریخ میں ان کی شہرت ہوئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں جہاں بھی موقع ملا نعتیہ اشعار اور قصائد کہنے سے باز نہیں آئے، قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے یہ اہل نقد و تاریخ میں مسلم ہیں، ان کے کلام میں ندرت اور نکتہ سنجی و نکتہ آفرینی اور مدمقابل کو لاجواب کرنے کی صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعر ہونے کے ساتھ بڑے مجاہد اور غازی تھے، اور اللہ کی راہ میں جان دینے کی تمنائیں ان کے دل میں ہر وقت کروٹیں لیتی رہتی تھیں، یہاں تک کہ جنگ موتہ میں انھوں نے نہایت مردانگی اور ایمان کی تازگی کے ساتھ جام شہادت نوش کیا اور دربار الٰہی میں قبولیت سے نوازے گئے۔

جان کی قیمت دیارِ عشق میں ہے کوئے دوست
جب سے یہ مژدہ سُنا ہے سر و بالِ دوش ہے

---

[1] حضرت جعفر بن ابی طالب اور حضرت زید بن حارثہ مراد ہیں۔

جناب رضوان اللہ صاحب
۱۷۸۔ابوالفضل اینکلو
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

کاروانِ عمر نشور

"ہوئے ہم زندگی کے ساتھ ساتھ"

نشور واحدی

۱۹۱۲ء سے ۱۹۸۲ء تک ستر برس۔ یعنی نشور واحدی کا عرصہ حیات ـــ تاریخ کے سیاق وسباق میں ستر برس کی کسی مدت کی حقیقت ہی کیا ہے لیکن نشور واحدی کے حوالے سے اس دورِ ہفتاد سالہ کا ایک جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

اس اثناء میں دنیا دو عظیم ترین جنگوں کی شعلہ باریوں سے دوچار ہوئی جن کی آنچ بلاشبہ ہندوستان تک پہنچی نتیجتاً آمرانِ مطلق سرنگوں ہوئے، جبر کی طاقتیں زمین بوس ہوئیں، نوآبادیاتی نظام درہم برہم ہوا، دنیا کے بعض گوشوں میں نئے فلسفۂ اشتراکیت پر عملی تجربہ ہوا۔ اسلام کے انقلابی فلسفہ کے بعد دنیا پہلی بار ایک نئے فلسفہ پر گوش بر آواز ہوئی تھی جس میں اسلام کا سیاسی فلسفۂ مساوات بطور اساس موجود تھا لیکن کم نگہی نے عقیدۂ "وحدت" کی خشتِ اوّل کھسکا دی تھی۔ نتیجہ ظاہر تھا ـــــ "تا ثریا می رود دیوارِ کج"

ان تغیرات اور سیاسی محرکات سے زندگی کا ہر پہلو متاثر ہو رہا تھا تو شعر و ادب کی دنیا اثر پذیر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتی تھی، عالمی ادب متاثر ہوا اور ہندوستانی ادب بھی۔ ۱۹۱۲ء سے لیکر پورے ۳۵ برس کی مدت کو وطن عزیز کی تاریخ کا ایک پر شور، ہیجانی بلکہ شورش بداماں عہد قرار دیا جا سکتا ہے پھر ۱۹۴۷ء میں وہ مسرت آگیں لمحات بھی آگئے جن کا خواب دیکھتے دیکھتے نہ جانے کتنی آنکھیں پتھرا گئیں، نہ جانے کتنے شعلۂ نفس نوجوان پھانسی کے پھندے

اتحادِ اقوام میں ایسی قہار قوت پنہاں ہے جو چاہے تو دم میں دنیا کو تباہ کر دے اور چاہے تو پل میں زندگی کو سنوار دے۔۔۔۔۔ میں نے اپنی کتاب میں اسی جبار قوت کا نام "وحدت" رکھا ہے اور شیخ اکبر کی طرح حیات و کائنات کی تمام طنابیں اسی کے دستِ تصرف میں دے دی ہیں۔"

قبل ازیں اسی تحریری سلسلے میں نشور صاحب فرما چکے ہیں:۔

"میں نے اپنی مثنوی میں ان مشاہدات سے استفادہ کیا ہے اور اس قیمتی روایت میں "آمیزش تضاد" کا پہلو عملی زندگی کے قیام کے لئے مدنظر رکھا ہے۔ یہ الگ اجتہاد اور اضافہ ہے کیونکہ متضاد عناصر کی جنگ و صلح سے حیات میں اعتدال کی تخلیق ہوتی ہے۔۔۔۔ "وحدت" ایک زندہ اور متحرک قوت ہے جو گوناگوں انقلابات پر قادر ہے اور نظامِ ہستی میں کون و فساد کا عنصر دہراتی رہتی ہے۔ شاید آخر میں ہر تضاد اور ہر اختلاف مٹ کر "وحدت" کی فتح ہو جائے۔"

کثرت میں وحدت کو سمجھنا سمجھانا تو آسان ہے، تضادات کو قوت محرکہ سمجھنا بھی ممکن ہے لیکن انھیں موجب اتحاد سمجھنا مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے نشور صاحب اس فلسفۂ وحدت میں کچھ اس طرح ڈوبے ہوئے تھے یا یہ فلسفہ ان پر کچھ اس طرح طاری ہو گیا تھا کہ ان کے فکری اور مادی وجود میں اختلاف یا تضاد نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی تھی چنانچہ فرماتے ہیں:

ہو لئے ہم زندگی کے ساتھ ساتھ یہ نہیں پوچھا کہاں سے آئی ہے

ایک زندگی ان کی اپنی تھی، دوسری اپنی ذات کے علاوہ باقی ماندہ دنیا کی۔ انھوں نے ان دونوں کو "وحدت" کی کٹھولی میں پگھلا کر ایک کر دیا تھا۔ اس کے بعد نہ تضاد باقی رہتا ہے نہ تصادم مکمل ہم آہنگی کی دنیا ہے جس میں شاعر سب کے ساتھ ساتھ رواں دواں ہے، بلا تکلف بلا تعرض۔ اُن کی یہ فکر ان کے رویّہ سے بھی صاف عیاں تھی۔ گویا یہ شعر محض ایک شعر نہیں بلکہ نشور صاحب کے فکر و فلسفہ اور ان کے ظاہر و باطن سب کا غمّاز بلکہ اعلان ہے۔

نشور صاحب کے ذہنی تشکیل کے دور میں رومی ان کے زیر مطالعہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے بلا کسی لاگ لپٹ کے نہ صرف مثنوی کا رنگ اختیار کیا بلکہ اپنے طور پر مثنوی کے دفتر اوّل

کو بوسہ دے کر اپنے گلے میں ڈال چکے تھے۔ لیکن وہ مسرت آگیں لمحے بھی خون میں نہاتے آئے۔

شاعر جیسی حساس مخلوق کے لئے انتہائی پُر آزمائش گھڑی تھی۔ ہر طرف متضاد طاقتیں پورے شد و مد سے کارفرما تھیں ایسے میں اپنی جگہ پر پاؤں جمائے رکھنا بھی کسی جہاد سے کم نہ تھا۔ نہ معلوم کتنے حوصلہ مندوں کے حوصلے چھوٹ گئے، ایسے میں کوئی حالات سے سمجھوتہ کرنا بھی چاہے تو کیسے کرے، کہیں ٹھہراؤ ہو تو سوچے، اس آزمائش سے گزر جانا بھی کچھ سہل نہ تھا۔ تمہید کسی قدر طولانی ہوگئی لیکن نشورؔ صاحب جن منزلوں اور مرحلوں سے سلامت روی کے ساتھ گزر گئے ان کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سی طاقت تھی جو ان کی رہنمائی کر رہی تھی؟ وہ ان کے مزاج کی لچک تھی جو انھیں وقت کے دھاروں سے ہم آہنگ کرتی ہوئی لئے جا رہی تھی۔ وہ مزاجی کیفیت خداداد تو تھی ہی خالص مذہبی اور متصوفانہ ماحول میں پروان چڑھی، بعد کے حالات میں اس پر صیقل ہوتی رہی۔ دوسرے ایک لفظ "وحدت" نشورؔ صاحب کی فکر میں ایسا راسخ ہوگیا کہ ان کا وجود، ان کا ظاہر باطن، ان کی شاعری سب اسی ایک محور پر گھومتے نظر آتے ہیں۔ انہی کی تحریر کے ایک اقتباس سے ان کے اس فلسفے کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

"لے دے کر دنیا میں صرف قدیم عقیدۂ توحید ہی ایک ایسے زندگی بخش اور ہمہ گیر نظام کا مالک ہے جو اقوامِ عالم کو ایک نئے اتحاد، نئے سکون، نئی زندگی اور نئی جمالیت کی طرف دعوت دے سکتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ اسلامی تاریخ کی تمام تر عظمت اسی توحید کے سانچے میں ڈھلی ہوئی انفرادیت اور انسانیت کی بے نظیر یادگار ہے۔"

"شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی اور مولانا رومی کے ارشادات اور اشارات سے میرے خیالات کو تقویت پہنچتی گئی اور میں موجودہ دنیا کو انقلاب وحدت کی روشنی میں دیکھنے لگا۔ میں نے آنے والی نئی دنیا کا تصور بھی "وحدت" کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ میری کتاب "مہابھارت ہند" اسی ذہنی تجربہ کی داستان ہے۔"

"ہر ذہین آدمی اتنا محسوس کرتا ہے کہ یک رنگی، یکجہتی، اتحادِ عمل، اتحادِ خیال،

کا ترجمہ ہی کر ڈالا، اسی رو میں حافظ کا بھی ترجمہ کر گئے۔

دیا ساقی نے اوّل روز وہ پیمانہ مستی میں — کہ میں ناآشنا پی کر ہوا دیوانہ مستی میں

حافظ کی غالباً پہلی غزل ہے۔

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند — وندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

نشور صاحب کا پہلا مجموعہ کلام "صہبائے ہند" بقول ان کے "بیس برس سے ستائیس برس تک" یعنی سات برس کی کاوشوں کا حاصل ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ۱۹۳۰ء والے عشرے کا بڑا حصہ۔ یہی نشور صاحب کے قیامِ کانپور کا ابتدائی دور ہے۔ وہ مکاتب و مدارس اور خانقاہوں سے گزرتے ہوئے گڈریا محال کی ایک مسجد میں حجرہ نشین ہو گئے اور خانقاہی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ وہی علامہ اقبال کا آخری دور ہے اور وہ زمانہ بھی جب علامہ ہندوستانی مسلمانوں کی فکری دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ وطن اور مذہب کا باہمی رشتہ، مذہب اسلام کی آفاقیت جیسے موضوعات ہر طرف زیرِ بحث تھے اور نئے اذہان کو دعوتِ فکر دے رہے تھے۔ اقبال کا یہ سحر نشور صاحب کی تعلیم و تربیت، مزاج کی افتاد اور رومی اور حافظ کی طرف ان کے طبعی رجحان پر مستزاد تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ "صہبائے ہند" کے بیشتر مشمولات اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اس کا ایک بڑا حصہ تو "مثنوی" کا ترجمہ ہی ہے جس کی ابتدا نالۂ نے سے ہوتی ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند — وز جدائی ہا شکایت می کند

زخم سینے میں زباں پر نالہ ہائے سوزِ غم — بانسری بھی ہے سراسر ایک بیمار الم

اصل سے بچھڑی ہوئی گھر بار سے چھوٹی ہوئی — نیستانِ سبز کے گلزار سے چھوٹی ہوئی

دیگر مشمولات ـــــ پیامِ جہد، جنگِ حق، عظمتِ رزق، یقینِ باطن، عبدیت کاملہ، وحدتِ اُمت وغیرہ اس حقیقت کے غماز ہیں کہ شاعر رومی اور اقبال کی پیدا کردہ فضا میں سانس لے رہا تھا۔ وہی جہد و عمل اور حرکت و دوام کا پیغام ہے، "ساری دنیائے ایمان" کے لئے ایک ہی مرکزی نظام کی تلقین ہے۔ لیکن اس دور کے کلام پر بحیثیت مجموعی نگاہ کرنے سے عیاں ہوتا ہے کہ شاعر اپنی اس گم گشتگی کے باوجود اس فلسفۂ وحدت سے کبھی غافل نہیں رہا جو ابتدا ہی میں اس پر طاری ہو گیا تھا، چنانچہ اسے "حرکت و دوام" میں بھی وطن کی مرکزیت برقرار رکھنے میں کوئی

قباحت نہیں محسوس ہوتی۔ سکون و حرکت کے اس تضاد میں بھی اسے ایک وحدت نظر آتی ہے۔ اسی طرح عیاں اور نہاں میں بھی تضاد کے باوجود اسے وحدت کا رشتہ موجود نظر آتا ہے۔ چند اشعار سے اس ذہنی فضا کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہے شریعت بھی عجب مجموعۂ رنگ تضاد — لطف و قہر و صلح و جنگ و اجتماع و انفراد
لا الٰہ وحدتِ ارواح وجدان و شعور — اور رسول اللہ توحید مساواتِ ظہور
ایک مرکز سے ہو کل دنیائے ایماں بانظام — ایک رہبر سے ہوں کل اقوامِ مسلم بستہ گام
ایک ہی تنظیم ہو کل عالمِ آگاہ کی — ایک ہی تہذیب ہو کل ملک الا اللہ کی

لیکن شاعر جو زندگی کے دوش بدوش چل رہا تھا اور تمام اضداد میں وحدت کا متلاشی تھا اپنے گرد و پیش اور اطراف و جوانب سے بے خبر اور بے پروا کس طرح رہ سکتا تھا، پیغام عمل دینے والا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا کس طرح رہ سکتا تھا چنانچہ یہ بھی دیکھیں کہ اسی ۱۹۳۰ء کے عشرے میں نشورِ واحدی کے گرد اور کیا کچھ ہو رہا تھا۔ وہاں بھی ایک عجب تضاد بلکہ زبردست تضاد نظر آتا ہے۔ ایک ایسی سیاست کی گرم بازاری تھی جس میں مغرب کے نوآبادیاتی نظام کو مغرب ہی کے عطا کردہ سوشلزم کے فلسفے سے کاٹنے کی کوشش کی جا رہی تھی، ہندوستانی شعر و ادب پر محیط ہوتی ہوئی ترقی پسندی اسی کا ایک حصہ تھی۔ اس حلقے کے شعراء مادیت کے قائل تھے، ماورائیت ان کے شعور سے باہر کی چیز تھی۔ سردار جعفری، مجاز، فیض وغیرہ اس گروہ کے سالارِ کارواں کی حیثیت رکھتے تھے لیکن جگر، جوش، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری کے بھی اپنے اپنے رنگ اتنے شوخ تھے کہ ان پر کسی اور رنگ کا چڑھنا محال تھا چنانچہ ترقی پسند بہ الفاظ دیگر نئے قسم کے مغرب پسند روایات کا سہارا لئے ہوئے ادب برائے زندگی کے فلسفے کو بڑھاوا دے رہے تھے۔

حیرت اس پر ہے کہ اس وقت ترقی پسندوں کو سوشلزم کا فلسفہ کسی اعتبار سے بھی مشرق کے سیاسی حقائق سے قریب کس طرح نظر آ رہا تھا۔ ہماری ساری روایات مطلق العنان حکمرانوں کی رزمیہ داستانوں کا حصہ ہیں۔ خواہ اشوک اعظم ہوں خواہ اکبر اعظم ان کی عظمتوں کے تاج خونابوں سے دھل کر آئے تھے۔ ہندوستانی تاریخ کی آفرینش سے اس وقت تک کا کوئی بھی زمانہ

لے لیا جائے اس میں آمریت کے سوا کسی اور نظام کی رمق بھی نہیں ملتی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ترقی پسندی کی باتیں خود فریبی کے سوا کچھ نہ تھیں لیکن نشور صاحب "تو با زمانہ بساز" کے مصداق کے اس گروہ کے دوش بدوش بھی کچھ دور تک چلے اور نتیجے کے طور پر "نادار کی عید" "خون میں پانی" "انسان" "انقلاب" اور اسی قبیل کی دوسری نظموں کے علاوہ معرا نظمیں بھی وجود میں آئیں جو "آتش و نم" کے مشمولات میں ہیں۔ چند اقتباسات برمحل معلوم ہوتے ہیں۔

زردار نمازی عید کے دن کپڑوں میں چمکتے جاتے ہیں
نادار مسلماں مسجد میں جاتے ہوئے بھی شرماتے ہیں
ملبوس پریشاں دل غمگیں افلاس کے نشتر کھاتے ہیں
مسجد کے فرشتے انساں کو انسان سے کمتر پاتے ہیں

قرآں سے دھواں سا اٹھتا ہے ایمان کا سر جھک جاتا ہے
تسبیح سے اٹھتے ہیں شعلے سجدوں کو پسینہ آتا ہے!

(نادار کی عید)

تہذیب کی صہبا کی بوتل اک دیدۂ نم رہ جائے گی
مذہب کی نوائے دلکش بھی اک آہِ الم رہ جائے گی
عالم کی سیاست ٹکرا کر اک جنگِ بہم رہ جائے گی
دنیا میں نہ ہوگا امن و سکوں مفلس کی جوانی جب تک ہے

(خون میں پانی)

اس قدر شعلہ فشاں
اور مشیں نوحہ کناں
دیکھنا عالمِ افلاس میں تسکینِ قلوب
روشنی اور غروب
شام کے وقت نکلتے ہیں مشینوں کے اسیر
جیسے زنداں کا خرام

(پنجۂ صیاد)

علم کی گردنِ نازک پہ ہے آہن کی طرح
دیوِ تنخواہ کا ہاتھ
زیست کی سانس اکھڑ جائے تو کچھ بات نہیں
ایک مٹھی یہ اناج
بیش قیمت ہے ترے نزع کے انفاس سے بھی (روٹی)

"صہبائے ہند" کے بعد "آتش و نم" آزادی وطن سے کوئی ایک سال قبل منصۂ شہود پر نمودار ہوئی۔ اس مجموعے کی تشکیل کے زمانے میں شاعر کی ذہنی فضا بدلی ہوئی ہے جو کہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے اس کے مزاجی خاصے کے عین مطابق ہے۔ ان دونوں مجموعوں میں اور ان کے بعد کے کلام میں بھی غزلوں کی موجودگی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ نشورؔ صاحب نظم گوئی کے باوجود جگرؔ مرادآبادی، حسرتؔ موہانی اور فراقؔ گورکھپوری کی موجودگی سے غافل نہیں ہیں۔ خود انہی کے اعترافات ملاحظہ ہوں۔

در جامِ من گم شدہ ترکیب دگر یافت آں مے کہ بہ خم خانۂ اقبال و جگر بود

"جب غزل کہتا تو جگرؔ صاحب سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔۔ جب مجھے قومی یا ملکی مسئلہ پر اظہار خیال کرنا ہوتا تو میں نظم کی طرف رجوع ہوتا یہاں اقبالؔ میری رہبری کرتے۔۔۔۔۔ مگر ایک ترکیب دگر کے ساتھ"

نشورؔ صاحب صرف غزل کہنے ہی تک جگرؔ صاحب کی ہمنوائی کرتے نظر نہیں آتے بلکہ اندازِ غزل خوانی میں بھی وہی غنائیت وہی والہانہ پن اور اپنے آپ میں گم ہو جانے کا عالم ہے جو سامعین کو مسحور کئے ہوئے ساتھ ساتھ لئے چلتا ہے۔

آزادی کے بعد نشورؔ صاحب کے ہمعصروں میں غزل گو شعرا کا غلبہ اور کثرت ہے خواہ طبعاً خواہ حالات سے ہم آہنگی کی مزاجی کیفیت کے مطابق نشورؔ صاحب بھی غزل گوئی پر اصرار کرتے ہیں اور فروغ جام (۱۹۵۹ء) سوادِ منزل (۱۹۶۸ء) گل افشانی گفتار (۱۹۷۷ء) اور سلکِ شبنم (۱۹۷۸ء) کو دیکھ کر اس تاثر کو تقویت ملتی ہے کہ انھوں نے غزل گوئی کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کر لیا۔ نظمیں خال خال نظر آتی ہیں۔ غزل گوئی میں بھی ان کی سادگی کا

وہ رنگ کہ ـــــ "ہولئے ہم زندگی کے ساتھ ساتھ ـــ یہ نہیں پوچھا کہاں سے آئی ہے"
پختہ تر ہوگیا ہے۔ افسوس ہے کہ نشورؔ صاحب کے آخری پانچ برس کا کلام دستیاب نہیں ہے جس کی حیثیت کسی حد تک فیصلہ کن ہوگی۔

نشورؔ صاحب کے کلام کے نصف درجن مجموعے شائع ہوئے۔ ان کے صاحبزادے نیاز واحدی نے "صہبائے ہند" اور "آتش و نم" کے نئے ایڈیشن بھی بڑی کاوشوں کے بعد شائع کرائے اور اس طرح ان کے ابتدائی کلام کو زمانے کی گرد میں گم ہوجانے سے بچالیا جس کے متعلق خود نشورؔ صاحب کا فرمانا ہے کہ "میں نے ابتدائی دور میں جو کلام پیش کیا وہ اتنا بلند ہے کہ اب میں اپنی عمر کے آخری دور میں اس طرح کے شعر نہیں کہہ سکتا" حالانکہ ایک جگہ اور انھوں نے خود فرمایا ہے کہ شاعر اپنے فن پر خود کوئی تبصرہ نہیں کرسکتا۔ تاہم اگر ان کے سابقہ قول کو درست مان لیا جائے تو اس کی معقول وجہ ہوسکتی ہے وہ یہ کہ شاعر زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کا عادی ہے اور ۲۰ء اور ۳۰ء میں زمانے کے جو تقاضے تھے وہ ۶۰ء اور ۷۰ء میں یکسر بدل گئے۔

ایک کمی یا ایک ضرورت کی طرف اشارہ بھی برمحل معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ نشورؔ صاحب کے کلام کی اشاعت اور اشاعت ثانی کے باوجود ادوار کے مطابق کوئی کلیات نہیں مرتب کی گئی جس سے عہد بہ عہد ان کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی۔ ان کے سابقہ مجموعے میں شامل کلام کا کچھ حصہ اگلے مجموعوں میں شامل ہوتا چلا گیا ہے اس کی وجہ سے صورت حال اور بھی گڈمڈ ہوجاتی ہے۔ نشورؔ صاحب کا سارا کلام محفوظ ہے اور نیاز واحدی کے ذوق و شوق میں بھی کوئی کمی نہیں ہے کیا ہی اچھا ہوتا کہ اردو کا کوئی ادارہ کلیاتِ نشورؔ مرتب کرنے میں ان کی پشت پناہی کرتا۔

63

شعر و ادب

قند فارسی ع۔ع۔ن

زہے جوری برآمد جان عالم

(۱)

منم رسوا حقیر و بے نوایم
فگندہ سر ز انبار گناہم
مگر در لحن جامی می سرایم
زہے جوری برآمد جانِ عالم

(۲)

بہ عصیاں ریختم من آبرویم
بہ صبحم رونقے دارد نہ شامم
بایں درماندگی مدح تو خوانم
زہے جوری برآمد جانِ عالم

(۳)

کجا سوز دل پروانہ یابم
کجا نقش رہ خاصاں بیارم
مگر شاہا بہ الطاف تو نازم
زہے جوری برآمد جان عالم

(۴)

توئی سرمایۂ دنیا و دینم
پناہِ ایں جہاں و آں جہانم
توئی آقا توئی مولا و یارم
زہے جوری برآمد جانِ عالم

(۵)

جہانم تیرہ گشت و تیرہ راہم
بہ رویت از خدا اشراق خواہم
پناہ بیکساں امید دارم
زہے جوری برآمد جان عالم

ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت جامیؒ کا عشق و تعلق اور اس میں ڈوبی ہوئی انکی فارسی نظم نے نہ معلوم کتنے سرد اور بے جان دلوں کو عشق نبویؐ کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ یہ وہ نازک مقام ہے جس کی بلندیاں عرش کو چھو رہی ہیں۔ مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندوی پروفیسر جامعہ ام القریٰ مکہ معظمہ نے "زہے جوری برآمد جان عالم" کی چٹکاری سے "در لحن جامی می سرایم" کا یہ تحفۂ عشق بارگاہِ رسالت میں پیش کیا ہے۔ حضرت مومن دہلوی کو بعد وفات کسی نے خواب میں دیکھ کر پوچھا کہ کیا گذری؟۔ فرمایا کہ: "میں نے حضرت شاہ عبدالعزیز (محدث دہلویؒ) کا مرثیہ لکھا تھا جس پر بخشش ہو گئی" مگر میری حسرتوں کی کس کو خبر کہ دل پر پتھر رکھ کر پانچواں مصرعہ حذف کرنے کی بے ادبی اور جسارت کا مرتکب ہو رہا ہوں جو حضرت جامیؒ کے عشق کی جان اور اس نظم کی اصل روح ہے۔

مگر شاہا بالطافِ تو نازم پناہ بیکساں امید دارم

(مولانا محمد مسعود نسیمؒ، ناظم مدرسہ صولتیہ)

شیث محمد اسماعیل اعظمی

غزل

وہ ربط جو جزیرہ نمائے عرب سے ہے
سب دار و گیر ہم پہ اسی کے سبب سے ہے

اک التجا حضور نہایت ادب سے ہے
شمعِ حرم بہ نرغۂ اغیار کب سے ہے

وہ لوگ کیوں نمودِ سحر کے نقیب ہیں
جن کا وجود منتِ ظلماتِ شب سے ہے

بیروت تا ستم کدۂ کابل و ہرات
اب سب کا امتحاں ترے نام و نسب سے ہے

یاں دیکھیں کس کے نام لکھی جائے گی شکست
اس بار موج خون کی یورش عقب سے ہے

پھر محوِ التفات ہے لیلائے انقلاب
ہونٹوں پہ اپنے نعرۂ تکبیر جب سے ہے

اب اعظمی غزل میں نئی بات چاہیئے
کیا فائدہ قصیدۂ رخسار و لب سے ہے

محمد خالد ندوی غازی پوری

بہ زبان رابطۂ ادب اسلامی

"ادب کی آبیاری کو دیا ہے باغباں ہم نے"

بہا کر خونِ دل کی ہیں چمن آرائیاں ہم نے
گلوں کو مسکراہٹ دی عنادل کو فغاں ہم نے
یہ برق و رعد کیا بادِ صبا بھی دشمنِ جاں تھی
مگر جوشِ جنوں میں رکھ دی طرحِ آشیاں ہم نے
یہ مہر و ماہ و اختر اور شفق کون و مکاں شاہد
سکھایا نوعِ انسانی کو طرزِ قدسیاں ہم نے
ادب وہ شے ہے جس سے روح کو ملتی ہے شادابی
ادب کی آبیاری کو دیا ہے باغباں ہم نے
غلط ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ولیم فورٹ کالج سے
ہوئی ترویج اردو کی یہ مانا ہے کہاں ہم نے
بہ فیضِ سید احمد اور اسماعیل کے صدقے
رواں، سادہ ادب کی صنف پائی ہے یہاں ہم نے
اگر کچھ دیکھنا ہو تو مشاہد یہ حقیقت ہے
کتاب 'تقویت الایماں' سے پائی زباں ہم نے
نگاہِ فیضِ سید سے چڑھے پرواں ادب پارے
ادب کی جاں تاثر ہے، یہ دیکھے ہیں عیاں ہم نے

رہے گی زندہ و تابندہ ان کی ذات کے صدقے
فروغِ جذبۂ تحریک کو دی ہے زباں ہم نے
کیا احسان سیّد ابوالحسن نے آج دنیا پر
کہ دیکھے آج اسلامی ادب کے کارواں ہم نے
جلو میں جن کے ہیں رابع، صباح دین و عبداللہ
سعید اور واضح کو پایا مثال کہکشاں ہم نے
مثالِ بلبلِ آشفتہ سر ہیں حضرت عرفاں
جنھیں پایا سیر تاریخ میں اک نکتہ داں ہم نے
مشیر و خواجہ و راشد، ضیاء یٰسین و محسن بھی
نذر اور نور و سلماں جن کو پایا گلفشاں ہم نے
طفیل و مرتضیٰ کی بات بھی گلشن کی زینت ہے
دواوین و کتب پہ ان کے دیکھے ہیں نشاں ہم نے
ہیں اور احباب دیگر بھی ادب کے جو ہیں شیدائی
نگارِ خانۂ ہستی میں وہ دیکھے جواں ہم نے
عزائم گر ہوں ہمدوش ثریا تو نہیں ڈر کچھ
ہزاروں بار دھرتی پر دیا ہے امتحاں ہم نے
"عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
کہ صیاد و قفس دیکھے نصیب دشمناں ہم نے
زمانہ محوِ حیرت ہے ہمارے عزم پر فیصل
کیا اس دور میں ذکرِ خدا کو حرزِ جاں ہم نے

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے اثرات

اردو زبان و ادب پر

ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۱۱، ۱۲ نومبر ۱۹۸۷ء

منتخب مقالات

ابتدائیہ

رابطہ ادب اسلامی نے ۱۹۸۷ء میں بتاریخ ۱۱۔۱۲ نومبر مذاکرۂ علمی بعنوان "حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے اثرات اُردو زبان و ادب پر" منعقد کیا تھا، یہ مذاکرۂ علمی ندوۃ العلماء کے ہال میں منعقد ہوا تھا، اس میں ۲۰ مقالے پیش کئے گئے تھے، ادارہ کاروانِ ادب اپنے معمول کے مطابق اس کے منتخب مقالے کاروانِ ادب کے تازہ شمارہ میں دے رہا ہے، مذاکرہ کے مقالات کے حصّہ کے بعد ایک انتخاب متعدد نظموں اور ایسی تحریروں کا بھی دیا جا رہا ہے جو برصغیر کے ممتاز اہل فکر و ادب کا نتیجۂ فکر ہیں، ان میں خاص طور پر سید الطائفہ مولانا سید سلیمان ندوی، مشہور مفکر و ادیب مولانا ابوالکلام آزاد، معروف مفکر اسلام مولانا مودودی مرحوم اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم کے نتیجۂ فکر ہیں۔

اس طریقہ سے کاروانِ ادب کا یہ شمارہ ایک طرح سے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک اور دعوتی کام کا ایک مفید جائزہ اور رپورٹ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، شمارہ کے شروع کا حصّہ حسب دستور سابق متنوع ادبی و تنقیدی نتائج فکر و ادب پر مشتمل ہے۔ اُمید ہے کہ سب دل چسپی اور افادیت کا باعث ہوگا۔

ہم کو مسرّت ہے کہ ہم اس سلسلۂ صحافت و ادب کو جاری رکھتے ہوئے ایک سال سے آگے بڑھ گئے ہیں، اور یہ دوسرے سال کا پہلا شمارہ ہے جو ہم اپنے معمول کے مطابق پیش کر رہے ہیں۔

(ادارۂ تحریر)

مولانا عبداللہ عباس ندوی

زبان وادب پر تحریک کے اثرات

کسی تحریک یا شخصیت کا اثر پہلے معاشرہ پر پڑتا ہے، افراد کے کردار میں تغیر رونما ہوتا ہے، ان کے فکر کی اساس بدلتی ہے اور پھر اس عمومی تغیر کا اثر زبان وادب پر پڑتا ہے، کیونکہ ادب فکر انسانی کا ترجمان یا مظہر ہے، فکر کو جیسا ایندھن ملے گا اسی کے مطابق اس کی بھاپ ظاہر ہوگی، ادبی عوامل کی اثر اندازی ایک دن میں نہیں ظاہر ہوتی، رفتہ رفتہ اور دھیمی رفتار میں یہ تبدیلی ظاہر ہوتی ہے، اس کے لیے کوئی حدِ فاصل Dead line نہیں متعین کرکے بتایا جاسکتا، مگر جب یہ تبدیلی قبول عام حاصل کرلیتی ہے تو پھر وہ چند افراد تک محدود نہیں رہتی، بلکہ وہ مذاق عام بن جاتی ہے، اگر کوئی فرد یا متعین گروہ اس اثر کو قبول نہیں کرتا تو اس کی نشان دہی کی جاتی ہے، اس کے اسباب تلاش کیے جاتے ہیں، تاویلیں کی جاتی ہیں کہ فلاں شاعر یا ادیب کے لیے کیا موانع اور رجحانات تھے جس کی وجہ سے اس کے کلام یا انتاج میں ماحول کا اثر نہیں ہے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے ارادت مندوں میں حکیم مومن خاں مومنؔ بھی شامل تھے، ان کا ایک قصیدہ جو سید صاحبؒ کی منقبت میں ہے نیز ان کا یہ شعر:

لے نام آرزو[1] کا تو دل سے نکال دیں　　مومن نہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

---

[1] مولانا فضل حق خیر آبادی آرزوؔ تخلص کرتے تھے اور ان سے مولانا اسماعیل شہیدؒ کا ایک علمی اختلاف تھا، انہی کی طرف اشارہ ہے۔ (روایت مولانا ابوالعرفان خاں ندوی)

یا مولانا خرم علی بلہوری کا قصیدۂ جہادیہ، ان ادبی تغیرات کا علامتی سنگ میل نہیں ہیں جو حضرت سید صاحبؒ کی تحریک سے مسلمانوں کے فکر عام پر چھا گیا تھا، ہم جن اثرات کے جویا ہیں وہ معاشرہ کے عمومی رجحان کو بتاتے ہیں، لیکن اس تجزیہ کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس وقت کے مذاق عام کو سمجھیں جو اس تحریک سے پہلے معاشرہ میں متعارف تھا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کا زمانہ محمد شاہی عصر کا آخری اور انگریزوں کی حکومت کا ابتدائی دور ہے، محمد شاہی دور کا آخری حصہ ہزیمت اور پسپائی کا زمانہ تھا، نادر شاہ کے حملہ نے دہلی کو تاراج کر دیا تھا، ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها وجعلوا اعزة أهلها أذلة (بادشاہ جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے عزت والوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں) کی زندہ تصویر سامنے تھی: اور انگریز حکمراں خونِ مسلم کے پیاسے جذبۂ انتقام سے پُر تھے، اسلامی وجود کی جڑیں اس سرزمین پر کھوکھلی ہو چکی تھیں، سوداؔ اور نظیر اکبر آبادی جیسے سنجیدہ اور صاحب درد و بصیرت شعراء تک، طنز و مزاح، کی آڑ میں اپنے دل کا غبار نکالنے پر مجبور تھے، دوسرے شعراء ایک زوال پذیر معاشرہ کی ترجمانی، معاملہ بندی اور غزل گوئی مبتذل سطح سے کر رہے تھے، مصحفیؔ، انشاءؔ، سوداؔ، میرؔ اور شاہ حاتم ہی کے معاصر جرأت بھی تھے، جن کے بارے میں اگر مولوی محمد حسین آزادؔ کا محاکمہ تسلیم کیا جائے تو میر تقی میرؔ کے بعد سب پر فائق تھے، ان کے بارے میں حکیم قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرہ مجموعۂ نغز میں یہ حکایت لکھتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ مرزا محمد تقی خاں ترقیؔ کے یہاں ایک مشاعرہ ہوا، اپنے بہت سے شاگردوں کو انھوں نے بلا لیا، اور کلام سناتے رہے لوگ داد دیتے رہے، یہاں تک کہ اشعار کا سمجھنا الگ رہا سننا بھی مشکل ہو گیا، اتفاقاً سخن سنج میر محمد تقی میرؔ بھی تشریف فرما تھے، قلندر بخش جرأت نے جرأت کی اور کھسک کر ان کے قریب جا پہنچے اور اپنے اشعار سنا کر تحسین و داد کے طالب ہوئے، میرؔ نے پہلے تو کئی بار ٹال دیا، مگر جب ان کا اصرار بڑھا تو اردو میں ان سے کہا، میاں تم مبتذل قسم کے مضامین باندھ لیا کرو، شعر کہنا تم کیا جانو۔" (فارسی سے ترجمہ)

دینی رنگ کی شاعری کا جہاں تک تعلق ہے وہ تصوف کے دائرہ میں محدود تھی، اور تصوف بھی وہ جس پر عقیدۂ وحدت الوجود یا ہمہ اوست، سایہ فگن رہا۔ اصلاح معاشرہ، اصلاح عقائد، جذبۂ

جذبۂ جہاد اور قربانی و فدائیت کے جذبات کو ابھارنے والی شاعری کا اس پورے دور میں سراغ نہیں ملتا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے دو محاذ تھے، ایک اصلاح عقائد و مشرکانہ رسوم و رواج کا انسداد، دوسرا جہاد۔ ان کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی مدظلہٗ کا جامع تبصرہ مختصر ترین الفاظ میں یہ ہے:۔

"حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۰۱-۱۲۲۶ھ) نے اس تحتی برِ اعظم میں جس عظیم اسلامی تحریک کی رہنمائی کی اس کی نظیر جامعیت، قوت تاثیر اور اسلام کی اولین دعوتِ حق اور طریق نبوت سے مناسبت میں نہ صرف تیرہویں صدی میں بلکہ نظر نہیں آتی ہے جو اس کا عہد ہے بلکہ گذشتہ کئی صدیوں میں بھی اس جیسی ایمان آفرین تحریک اور صادقین و مخلصین کی ایسی مربوط و منظم جماعت کا سراغ نہیں ملتا، وہ عقائد و اعمال کی تصحیح، افراد کی تربیت، وعظ و تبلیغ اور جہاد و سرفروشی کے وسیع و طویل محاذ پر جس طرح سرگرم عمل رہے اس کا اثر صرف میدان کارزار اور ان کے معاصر نسل تک محدود نہ رہا بلکہ اس نے آئندہ نسل، اپنے بعد میں آنے والے اہلِ حق، اصحابِ دعوت اور دین کے علمبرداروں اور خادموں پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے۔"

جن دیرپا نقوش کی طرف مولانا نے اشارہ فرمایا ہے وہ ایک وسیع تحقیق کا کام ہے، ان میں وہ اثرات جو ادباء کے نتائج فکر پر پڑے ان کا جائزہ بھی ایک مقالہ سے زیادہ وسعت کا طالب ہے، البتہ جو باتیں بہت نمایاں ہیں ان میں حسب ذیل نشانات ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

تیرہویں صدی میں محمد شاہی دور کے اختتام اور انگریزی تسلط کی ابتداء میں سیاسی تداخل کا زمانہ تھا۔ اس کی طرف میں نے ابتدائی سطروں میں اشارہ کیا ہے، تحریک جہاد کے بعد جو شعراء صف اوّل میں آتے ہیں ان میں ایک ٹھہراؤ اور وقار محسوس ہوتا ہے، یہی نہیں بلکہ ان کے کلام میں طنز و مزاح کے نام پر تضحیک کا جو عنصر تھا وہ ختم ہو گیا۔ اس دور کے سرخیل شعراء میں استاذ ذوقؔ کے یہاں بھی وہ ابتذال نہیں ہے جو ان کے متقدمین کے کلام کا ناقابلِ انکار عنصر تھا، ایک زمین ہے "زباں کے لیے"، "آسماں کے لیے" اس میں استاذ ذوقؔ کے یہ اشعار اس بات کے غماز

ہیں کہ وہ اپنے پیش رو شعراء سے مختلف نظر آتے ہیں، اور ان کے کلام میں بالواسطہ ایک اسلامی دعوت کا اثر نمایاں ہے، کہتے ہیں:

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لیے — یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لیے
نہیں ثبات بلندی و عزّ و شاں کے لیے — کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لیے
بیان درد و محبت جو ہو تو کیوں کر ہو — زباں نہ دل کے لیے ہے نہ دل زباں کے لیے
مرے مزار پہ کس وجہ سے نہ برسے نور — کہ جان دی تری روئے عرق فشاں کے لیے

یہ وہی زمین ہے جس میں مومن کی مشہور غزل ہے:

نہ پائے یار کے بوسے نہ آستاں کے لیے — عبث میں خاک ہوا میل آسماں کے لیے
نوید امن ہے بیداد، دوست جاں کے لیے — رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لیے

استاذ ذوق کے کلام میں دینی احساسات کا پایا جانا اور تصوّف کی طرف میلان اس دینی فکر کے غماز ہیں جو اس دور میں شروع ہو چکا تھا، ان کی ایک غزل ہے "مچل جائے تو اچھا، سنبھل جائے تو اچھا"، اس میں ان کا یہ شعر ایسا ہے کہ اگر خواجہ میر درد کے کلام میں ملا دیا جائے تو مشکل سے تمیز کی جا سکے گی:

جو آنکھ کہ بے نم ہو رہے کور تو بہتر
جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا

لیکن ایسے دو چار شعروں کا پایا جانا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ تحریک سے براہ راست متأثر تھے، یہی نہیں بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کو فکری لحاظ سے بعد اور عدم مناسبت ہو، اور اگر مخالف گروپ میں رہے ہوں اس میں بھی کوئی حیرت کی بات نہ ہوگی، لیکن کسی جاندار تحریک کے اثرات عام فضا اور ماحول پر ظاہر ہونے لگتے ہیں، وہ ذوق ایسا عام ہو جاتا ہے کہ اس ڈگر سے باہر قدم نکالنا مشکل ہو جاتا ہے، اس کی ایک مثال اسی زمانہ کی ہے، چالیسویں دہے میں مشرق وسطیٰ میں الاخوان المسلمون کی تحریک نوجوانوں میں مقبول ہونے لگی، کالجوں اور مدرسوں کے نوجوان جرأت کے ساتھ میدان میں بڑھنے لگے، جنسی ادب اور فحش رسائل جو اس وقت سکۂ رائج الوقت تھے کھوٹے ثابت ہونے لگے، بازاروں میں مانگ دینی کتابوں کی بڑھنے لگی، اس وقت وہ حضرات

جو کل تک پیٹ اور جنس سے آگے نہیں پہنچ سکتے تھے وہ اسلامی تاریخ کے ابطال (ہیروز) پر لکھنے لگے، اور متعدد آبرو باختہ قسم کے اخبار نویسوں کو اپنی ڈگر بدلنا پڑی، یہاں تک کہ مخالف بھی اپنے قلم کو سنبھال کر اسلام کے علاوہ دوسرے عنوانات کا سہارا لے کر اخلاقیات پر ایک دو مضمون شائع کرنے لگے۔ یہی صورت حال سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے زمانہ میں اس ملک کی ہو گئی تھی، یہ تحریک بالاکوٹ میں ختم نہیں ہو گئی بلکہ اس کے بعد ایک عمومی مزاج بن گیا جس نے اس وقت کے اور بعد میں آنے والے شعراء و ادباء کی فکر پر اثر کیا۔

اردو کے اصحاب طرز مصنفین، سرسید، حالی، شبلی، محمد حسین آزاد اور راشد الخیری یا ڈپٹی نذیر احمد سب کے سب اخلاق و علم کے داعی تھے، ان کا دعوت دینا اگرچہ براہ راست اس تحریک کے اثرات میں داخل نہ ہو مگر ان کی تحریروں کا قبول عام حاصل کرنا یقیناً اس تحریک کا اثر تھا، ورنہ بھلا حالی کا وعظ توحید اور رسم و رواج کے جسم پر نشتر چلانا پہلے کوئی برداشت کر سکتا تھا، وہ بھی ایسے معاشرہ میں جس کا ایک عکس ڈپٹی نذیر احمد کی توبۃ النصوح میں ملتا ہے اور جس کے متعلق ان پر تحقیقی کام کرنے والوں نے لکھا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے بالکل صحیح عکاسی کی ہے۔

ان کے افسانہ کا ایک کردار کلیم ہے، جس کے باپ ایک خوش حال اور نیک نام تھے، انھوں نے مذہب و اخلاق کا راستہ اختیار کر لیا تھا اور چاہتے تھے کہ ان کی اولاد بھی اسی راہ پر گامزن ہو، چھوٹے لڑکے کو اتفاق سے مدرسہ ہی میں ایک ساتھی مل گیا جس کی تربیت اچھی تھی، چھوٹی لڑکی بھی فطرتاً صالحہ تھی، مگر بڑے صاحبزادے عیش و تنعم کے پروردہ تھے انھوں نے باپ سے اسی مذہبی رجحان کی بنا پر بغاوت کر لی، باپ سمجھاتا ہے مگر یہ مانتے نہیں، باپ بیٹے کے درمیان، ماں واسطہ بنی ہیں، ماں جب سمجھاتی ہے کہ باپ کی بات مانو تو صاحبزادے جو فرماتے ہیں وہ اس زمانہ کے معیار تعلیم، معیار اخلاق اور سوسائٹی میں معیاری بڑائی کی تصویر ہے، وہ ماں سے کہتے ہیں:

"دنیا میں جیسے اور شریف اور معزز خاندانوں کے بیٹے ہیں، اگر میں سب میں اچھا نہیں تو کسی سے برا بھی نہیں، مشاعرے میں میری غزل، ساتھ کے مشق کرنے والوں میں سب سے بڑھی چڑھی ہوتی ہے، شطرنج میں، مرزا شاہ رخ تو خیر پرانے کھیلنے

والوں میں ہیں اور حق یہ ہے کہ اچھی شطرنج کھیل کھیلتے ہیں، دوسرا کوئی مجھ کو مات کردے تو البتہ میں اس کی ٹانگ تلے سے نکل جاؤں، ہمارے محلے میں میاں وزیر بادشاہی پیادوں کے جمعدار بڑے شاطروں میں مشہور ہیں میں فرزین اٹھا کر ان کے ساتھ کھیلتا ہوں، گنجفہ اگرچہ میں کم کھیلتا ہوں لیکن بیٹھ جاؤں تو ایسا بھی نہیں کہ کوئی صفو پر نادری چڑھائے، اور قریب قریب یہی حال تاش اور چوسر کا ہے، کبوتر جیسے آج ہماری چھتری کے دمدار ہیں، شہر میں شاید دو چار جگہ اور ہوں گے، پتنگ میں ایسا اڑاتا ہوں کہ ایک دھیلے سے دو ٹھڈے کی تکل ایک نہیں تو سیکڑوں کاٹی ہوں گی، لکھنے سے میں عاری نہیں، پڑھنے سے میں عاجز نہیں، میں نہیں جانتا کہ امیروں اور امیرزادوں کا وہ کون سا ہنر ہے جو مجھ کو نہیں آتا:

قسمت سے تو لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

کل کی بات ہے کہ میری مدح ہوتی تھی اور مجھ کو ہر ہر بات پر شاباش ملتی تھی، اب دفعتہً میں ایسا بے ہنر ہو گیا کہ مجھ کو سیکھنے اور تعلیم پانے کی ضرورت ہے:

ہائے ہم کیا کہیں کیا ہو گئے کیا کیا ہو کر

میرا کون سا فعل ہے جو تم کو یا ابا جان کو معلوم نہیں، کیا ابا جان نے میری غزلیں نہیں سنیں؟ میں ان کے ہاتھ کے صاد کیے ہوئے دکھا سکتا ہوں، ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں گزرا شطرنج کا ایک بڑا مشکل نقشہ ابا جان نے کسی اخبار میں دیکھا اس کو میں نے حل کیا، کبوتر اڑاتے تم نے نہیں دیکھے یا پتنگوں کی لڑائی انھوں نے نہیں سنی، کبھی تم نے روکا یا انھوں نے ٹوکا، اب نئی بات البتہ سننے میں آتی ہے کہ نماز پڑھو، مسجد میں معتکف بن کر بیٹھو، کھیلو مت، کسی یار آشنا سے ملو مت، مت جاؤ میلے تماشے میں مت شریک ہو، بھلا کوئی مجھ سے یہ باتیں ہونے والی ہیں:

جو دل قمار خانے میں بُت سے لگا چکے
وہ کعبتیں چھوڑ کے کعبے کو جا چکے

یہ اس زمانہ کے معاشرے کی ہو بہو تصویر ہے جو خوش حال کھاتے پیتے گھرانوں میں رائج تھی، مذہبی تعلیم کہاں تک تھی اور ان کو کس نظر سے دیکھا جاتا تھا، اس کا بیان بھی ڈپٹی نذیر احمد ہی سے سنیے جو اپنے ناول کے کردار کلیم کی محاکات کرتے ہیں۔

کلیم اپنی ماں سے کہتا ہے:

اگر (والد صاحب کو) یہی منظور تھا کہ میں بڑا ہو کر مسجد کا مُلّا یا قبرستان کا قرآن خواں یا لنگر خانہ کا ٹکڑ گدا بنوں تو شروع ہی سے مجھ کو ایسی تعلیم کی ہوتی کہ اب تک بھلا کچھ نہیں تو دو چار حج بھی کر آیا ہوتا، پنچایت میں میری قرأت کی دھوم ہوتی، تراویح میں مرے لہجۂ قرآن خوانی کی شہرت، کہیں مردہ مرتا جائے نماز مجھ کو ملتی، قربانی ہوتی کھال میرے پاس آتی، صدقے کا میں اڑھیتا ہوتا، زکوٰۃ کا ٹھیکیدار، دعوتوں کا مستحق، خیرات کا حقدار۔

غرض تعلیم و معاشرت کے دو ہی رُخ تھے، ایک تو وہ جو اوپر گذر چکا، شطرنج، شاعری اور کبوتر بازی میں مہارت، دوسرے خیرات و زکات اور چرم قربانی کا حقدار ہونا، ان دونوں کے درمیان کوئی راستہ نہیں تھا، کہ ایک تاجر ہو، زراعت پیشہ ہو، ملازم ہو اور دین کا پابند بھی، اصلاح عقیدہ، اصلاح رسوم اور جذبۂ جہاد تو اس وقت سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا، ایسے ماحول میں ایک نئی تحریک اصلاح معاشرہ اور جہاد کی اٹھتی ہے اور وہ مزاج و ذوق پر اثر انداز ہوتی ہے، لوگ حالی کی مسدس پر سر دھننے لگتے ہیں، سرسید مسلمانوں کی رفاہ اور آئندہ نسل میں مسلمانوں کو سربلند کرنے کا ذریعہ عصری تعلیم کو سمجھتے ہیں، ان کے نقشۂ عمل سے علماء کو اختلاف ہوتا ہے، لیکن ہم یہ نہیں بھول سکتے کہ اس وقت ان کو مفسر قرآن اور تہذیب الاخلاق کا معلّم بن کر سامنے آنا پڑا، قوم کا مزاج ایسا بن گیا کہ علی گڑھ اور آکسفورڈ کے فاضل، انگریزی کے اعلیٰ انشاء پرداز مسٹر محمد علی کو مولانا محمد علی، اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی کو خادم کعبہ کا لباس پہن کر آنا پڑا، جب کہیں وہ مسلمان قوم کی لیڈری کے مستحق ہوئے، راقم کو اپنے بچپن کا وہ زمانہ یاد ہے کہ ۲۳ء یا ۱۹۲۴ء

میں بہار میں الکشن تھا، اس کے ایک امیدوار مسٹر یونس بیرسٹر تھے، ان کے نام کے بڑے بڑے پوسٹر بازاروں میں لگے تھے کہ حاجی محمد یونس کو ووٹ دیجئے، نہ بیرسٹر نہ مسٹر حاجی محمد یونس، کیونکہ وہ اور ان کے کارندے جانتے تھے کہ مسلمانوں میں (اس وقت جداگانہ انتخاب ہوتا تھا) وہی مقبول ہو سکتا ہے جو یا تو عالم ہو یا حاجی ہو، حافظ ہو، بے شک یہ صورت حال مسلم لیگ اور مسٹر جناح کی قیادت نے ختم کر دی، جس کے سیاسی پس منظر پر گفتگو مقصود نہیں ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح و جہاد سے پہلے اور ان کے عصر تک جو دینی رجحان تھا اس کا عکس ڈپٹی نذیر احمد کی ناولوں میں نظر آتا ہے اور ان کی تحریک کے اثرات پھیل جانے کے بعد وہ نقشہ ہے کہ حالی، سرسید، راشد الخیری، نذیر احمد معلّم اخلاق کی حیثیت سے قوم کے سامنے آئے تو ان کی بات سُنی گئی، لہٰذا اس دور میں زبان و ادب پر جو مذہب کی چھاپ نظر آتی ہے وہ تحریک کے دوررس نتائج کا پرتو ہے۔ ●●

حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی
صدر شعبۂ عربی، پشاور یونیورسٹی

حضرت سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ بریلوی کی تحریک کا اثر پشتو ادب پر

حضرت سیّد احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک نے اُردو ادب پر جو اثر ڈالا اسے دنیا جانتی ہے اور موجودہ مذاکرہ میں بھی آپ اس پر متعدد وقیع مقالات سُن چکے بہتر ہے کہ اس عظیم محفل میں صوبہ سرحد کی اس سرزمین کی زبان پشتو پر جو اس تحریک کے اثرات مرتب ہوئے اس کے بارے میں مختصر چند کلمات عرض کر دیے جائیں۔

یوں تو پٹھان اور ان کی سرزمین سرحد حضرت سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کی وجہ سے بدنام ہے۔ گو کہ موصوف نے اسی سرزمین کو اس کی ایمانی حرارت و جذبۂ جہاد کی بنا پر اپنے پہلے کیمپ کے طور پر منتخب فرمایا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ چند غدّار خوانین اور نوابوں اور ان کے مفاد پرست حامیوں کے علاوہ پورا علاقہ حضرت امیر شہید رحمۃ اللہ علیہ کا حامی تھا اور اس نے آپ کی مدد کو اپنی سعادت سمجھا جنگوں میں آپکے شانہ بشانہ لڑے اور آپ کی تحریک کو خوش آمدید کہا، مجاہدین نے بالاکوٹ کے مقام پر اپنے خون سے جو نقوش ثبت کیے تھے پشتو ادب نے اسے نظم و نثر میں قلم بند کیا اور اس خونیں اور جانبازی کی داستان نے بزمیہ شاعری کی جگہ رزمیہ شاعری کو وجود بخشا جو پٹھانوں کے مجاہدانہ کردار کی آئینہ دار تھی، جنگ نامہ، چار بیتے،

پٹے، غزل، نیمکئی۔ بدلہ[1] سب اصناف شاعری جنگ وجہاد کے جذبات سے بھرپور ہو گئے، چونکہ پٹھانوں کا عمومی مزاج جہاد وقتال کا خوگر ہے، اس لیے نہ صرف حضرت امیر شہید رحمۃ اللہ علیہ کے کارناموں کو پشتو شاعری میں اجاگر کیا گیا بلکہ اپنے مجاہد مرشد اور رہنماؤں کے واقعات کو بھی رزمیہ شاعری کی زینت بنایا اس قسم کے سیکڑوں چاربیتے اور بدلے لکھے گئے جو مردانہ مجالس اور حجروں میں گائے جاتے تھے اس کے علاوہ گھروں میں گائے جانے والے گیتوں اور سندروں[2] میں بھی یہی روح کارفرما ہو گئی اور گھروں میں بھی یہی آتشیں مجاہدانہ نغمے یا "رجزیہ" اشعار پڑھے جاتے تھے۔

حضرت امیر شہیدؒ کی تحریک نے جو جذبۂ جہاد پیدا کیا تھا اور اسی جذبہ نے جیسے پشتو شاعری میں چاربیتہ اور دیگر اصناف سخن کو ان کے کارناموں سے گراں بار کیا تھا اسی طرح بعد کے ہونے والے دینی معرکے اور جنگیں عوامی شعراء کا عنوان و مشق سخن بن گئیں چنانچہ پہلے سکھوں اور پھر انگریزوں کے خلاف جنگیں اخوند صاحب سوات کی سرکردگی میں ہوئیں جن میں باجوڑ اور اسمار سے لے کر کابل تک کے پٹھانوں نے حصہ لیا اور ان چاربیتوں کا موضوع بن گئیں اسی طرح کابل، ڈکہ، ارناوی گداو، ملاکنڈ، چکدرہ کامرانی تیراہ کے انگریزوں کے خلاف معرکے، ہڈے ملا صاحب، چکنور ملا صاحب اور عراخان کے جہاد ان چاربیتوں کا پرلطف اور زوردار مضمون ہے اور پشتو ادب کا وہ جاندار حصہ ہیں جس نے پٹھانوں میں جذبۂ جہاد اور استعماریت کے خلاف سرفروشی کو زندہ رکھا اور اسے دوام بخشا بلکہ پشتو چاربیتہ اور بدلہ نے ملی طور پر اسلامی اور دینی جذبے کو استوار رکھا اور اسے مزید توانائی بخشی۔ چاربیتہ کی یہی کیفیت دگر اصناف شاعری پٹہ، بدلہ اور نیمکئی وغیرہ میں سرایت کر گئی اور آگے بڑھ کر جب سیاسی تحریکوں کا دور آیا تو چاربیتہ وغیرہ نے وہاں بھی وہی کردار ادا کیا غرض پشتو ادب کے اس پرزور محرک نے اس خطے کی تاریخ سیاست اور شخصیات پر گہرا اثر ڈالا۔

یہ چاربیتے عربی جاہلی شاعری کی طرح لوح وقلم کی بجائے انسانی حافظے پر مرتسم ہوتے تھے پٹھانوں کے اس وسیع خطے میں جو جنگیں پہلے سکھوں اور پھر انگریزوں سے ہوئیں عصری شعراء کا موضوع بن گئیں اور انھوں نے اپنے مجاہدانہ جذبات کو چاربیتوں کی صورت میں پیش کیا اس دور

---

[1] یہ سب پشتو شاعری کے مشہور اصناف سخن ہیں۔ [2] پشتو گیت۔

کے متعدد شعراء مثلاً برہان اخون، نوردین اخون گل محمد، احمد گل، حمید اخون، علی خان، مقصود گل محمد دین، اکبر شاہ، نواب خاں، نور علی شاہ، طالب گل پایاد، میاں عنوان الدین، عبداللہ اخون، غریبے، محمود غازی الدین ارسلا اخون، عبدالغفار، عیسیٰ اخون زادہ، توکل، شاہ گل، ناصر سکیا، گل محمد ڈوڈیال والے میر افضل، علی خاں اخون، امانت اخون، بہرام، برآور، دوستم، عجم، بنیری، حمید گل، مجید شاہ، میرا باجی، میر عبداللہ، میاں رجب، محمد جی، محمد جان، میر محمد قاسم، سید احمد، سید کمال، یاسین، محمود جان کریم، ظریف خاں پشاوری، سراج بنوں والے وغیرہ نے ہر اس جہاد کو جو کسی خاص اہمیت کا حامل تھا اپنے پر لطف اور جاندار چار بیتوں سے عامۃ الناس میں دوام بخشا اسی طرح یہ رزمیہ چار بیتے پٹھانوں کی مجاہدانہ زندگی کا سامان اور ان کی تاریخی تگ و تاز و جنگی مہمات کا دلچسپ مرقع بن گئے جس میں ان کی تاریخ دمکتی دکھائی دیتی ہے۔

اس رزمیہ شاعری اور مجاہدانہ ترانوں کی ابتداء چونکہ حضرت امیر شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت اور اُن کے ذوق جہاد کی مرہون منت ہے اس لیے یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ بالاکوٹ کی بلندیوں پر جن شہدا کا پاک خون گرا تھا وہ کسی صورت رائیگاں نہیں گیا بلکہ اس خطے میں جہاد و حریت کے جس پودے کو انھوں نے لگایا تھا اس کی پیہم آبیاری کرتا رہا اور انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی کرتا رہے گا اور یہ شجر ہمیشہ برگ و بار لاتا رہے گا اور اس کے اثرات ملت کو حیات تازہ کا پیغام بخشتے رہیں گے۔

سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملت ما سازگار آمد

کیا یہ جذبۂ جہاد افغان مجاہدین کی موجودہ کامرانیوں میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ مجاہدین کی تعریف میں جو چار بیتے لکھے گئے ظاہر ہے وہ سب اس مختصر مجلس میں نہیں پیش کیے جا سکتے نمونۃً دو ایسے چار بیتے پیش کرتا ہوں جو مدتوں عوام و خواص کی محفلوں میں پڑھے جاتے رہے۔

لہ ہندہ دی راغلی پہ غزا ایسے سفر کہ
لہ ہندہ دی راغلی خو وطن ئے بریلی
اوس ناست دی پہ ملکا کبن جوروی کوئی

پہ داکہ ورتہ ناست دی تل ثنا د پاک اکبر کہ
لہ ہندہ دی راغلی پہ غزا ایسے سفر کہ

"ہند سے آکر انھوں نے جہاد کے لیے سفر اختیار کیا اگرچہ ان کا وطن بریلی ہے مگر ملکا میں بیٹھ کر کارتوس بنا رہے ہیں، وہ کھلے میدان میں بیٹھ کے اللہ پاک کی ثنا کرتے ہیں۔ ہند سے آکر انھوں نے جہاد کے لیے سفر اختیار کیا ہے۔"

ایک طویل سات بندوں پر مشتمل چار بیتہ گل محمد شاعر نے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کہا ہے۔

سیّد احمدؒ بادشاہ دِ بولی بہرام خاں مولوی
پہ کنھار جنگ دے کنھار شہ پہ تابوستان مولوی

(اے مولوی بہرام خاں! تمہیں سیّد احمدؒ بادشاہ بلا رہے ہیں۔ کنھار (ہزارہ) پر جنگ ہو رہی ہے۔ اے مولوی! کنھار تجھ پر گلستاں ہو جائے)

سیّد احمدؒ بادشاہ دِ بولی ثنہ کہ حال دے نا
دہ دے مردو دوہم را کرے خدائے اقبال نا
د اسلام ننگ نشتہ غالب خلق ارزال دے نا
دَ زیرو توپے خلاصیدے پہ شہینان مولوی

(اے مولوی بہرام خاں! تمہیں سیّد احمدؒ بادشاہ بلا رہے ہیں کہ کیا حال ہے۔ انھوں نے مردودوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اقبال مند بنایا ہے۔ اسلام پر آج کوئی عزت نہیں کر رہا کہ اکثریت رزیلوں کی ہے۔ اے مولوی! پیتل کے توپ داغے جا رہے تھے۔

دَ زیرو توپے خلاصیدے چہ دزھار وو نا
مزکہ اسمان مثول ترگئی چہ دوند غبار وو نا
دہ مولوی صاحب پہ لاس کنے ذوالفقار روو نا
چہ لہ مردو دسرہ یے شہ جنگ یہ سین میدان مولوی

(پیتل کی توپیں داغی جارہی تھیں جس سے گھن گرج پیدا ہو رہا تھا۔ اتنا دھند اور گرد وغبار تھا کہ زمین اور آسمان چھپ گئے تھے اور مولوی صاحب کے ہاتھ میں ذوالفقار تھی، جس وقت ان کی مردودو کے ساتھ کھلے میدان میں جنگ ہو گئی تھی۔

چہ لہ مردود سرہ یئے شہ جنگ دلعل محمد قندھاری
سیلانو ماتے چہ اوکرہ ولار حیران کبری
دجنگ تدبیر برابر نہ شہ داوہ ورح دلری
پورہ یئے نہ وژوبل لار شہ ناصرخاں مولوی

(اور جس وقت لعل محمد قندھاری کی مردود کیساتھ جنگ ہوئی اور سادات کو پیچھے ہٹنا پڑا اور کبری حیران کھڑے تھے اور جنگ کی تدبیر اس دن کی راس نہ آئی کہ وہ دن پیچھے ہٹنے کا تھا اور ناصرخان مولوی میدان جنگ سے زخمی چلے گئے کہ اس کا وقت پورا نہیں ہوا تھا۔

دا ناصرخان غازی دتورے یومزے دو خلقہ
غازیانو پیخ کے ونہ کرو دیر لرے دو خلقہ
تکی یے وکرہ چہ پہ لوزم کبرے دو خلقہ
دیرے پے پورتہ کرے رواں چہ مثول میدان مولوی

(یہ ناصرخاں غازی تو تلوار کے ایک شیر تھے۔ اس دن دھوکہ ہوا ورنہ غازیوں نے تو کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، اور جو بھی گری تھا اس نے دھوکہ کیا۔ اے مولوی! سب نے ڈیرے اٹھالیے جب سادات روانہ ہو گئے۔

سید احمد بادشاہ روان شہ کوز شو مکرے وتہ
کفار پرے دیر مثول غلبہ غو شہ خبرے وتہ
حور و پیالے راوے شہ ورد جنت لرے وتہ
خدائے دلہ سیلے تا سو کاندے جنتیاں مولوی

(باقی صفحہ پر)

ڈاکٹر محمد راشد ندوی

معروف اہل قلم کی تصنیفات میں

تحریک سید احمد شہیدؒ کی بازگشت

تاریخ انسانی میں ہزاروں ہستیاں ایسی گذری ہیں جن کے نام و کردار سے تاریخ کے صفحات مزین رہے ہیں۔ اور جن کے ذکر سے آنکھوں میں چمک اور دلوں میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ انھیں مبارک ہستیوں میں کچھ ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو تاریخ کا صرف جزو ہی نہیں بلکہ ان کی ذات سے ایک نئی تاریخ مرتب ہوتی ہے اور وہ ساری انسانیت کے لیے سرمایہ ناز و افتخار ہوتے ہیں۔ انھیں عظیم ہستیوں میں علامہ اور مجدد سید احمد شہیدؒ بھی ہیں۔ جنکی زندگی کا ہر لمحہ ہندوستان کی تاریخ ہی کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کی تاریخ کے لیے مشعل راہ رہے گا۔ اور جب بھی بھٹکتی ہوئی انسانیت کو کسی مرد مجاہد کی ضرورت ہوئی تو اپنی زندگی کے لائحہ عمل بنانے میں اس مبارک ذات سے راہ کی تعین کے لیے روشنی حاصل کرے گا۔ سید احمد شہیدؒ ۱۷۷۶ء میں اُتر پردیش کے ایک ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے معرکہ میں احیائے دین کی خاطر جام شہادت نوش فرمایا۔ اس طرح انھیں اس عالم فانی میں صرف پینتالیس سال رہنے کا موقع ملا۔ جو بظاہر بہت قلیل نظر آتا ہے لیکن ان کی زندگی کے اعمال اور کارناموں کو اگر ترازو پر رکھا جائے تو وہ کارنامے ہزاروں انسانوں کے برسوں کے کارناموں پر بھاری ہوں گے۔ یہاں سید صاحبؒ کے کارناموں پر بحث کرنے کے بجائے ان کے ان اثرات اور ان نقوش کا جائزہ لینا زیادہ مناسب ہے جو ہندوستان کے اہل فکر و نظر کے قلب و جگر پر پڑے اور جن کا اظہار انھوں نے نثر میں کیا۔

سید صاحبؒ کی شہادت ۱۸۳۱ء میں ہوئی اور یہ زمانہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ سارے

عالم اسلام کے لیے بڑا نازک تھا۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں کے سامنے مغلیہ حکومت کے بڑے سے بڑے قلعے شیش محل ثابت ہو رہے تھے۔ اور ان کے سپاہیوں کے سامنے حکومتوں اور ریاستوں کے لشکر جرار موسم خزاں کی پتیوں کی طرح گر رہے تھے۔ اس نازک دور میں سیّد احمد شہیدؒ نے حکومت کے سہارے کے بجائے عوام کی فوج تیار کی اور ان کو

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ

کی بشارت دیتے ہوئے ہر معرکے کیلئے آگے بڑھایا۔ اور ان کے اندر اتباع سنّت کے ساتھ ساتھ احیائے سنّت اور اقامت دین کا جذبہ بھی پیدا کیا۔ اس لیے جب وہ ایک معرکہ سے دوسرے معرکہ کی طرف جاتے تو ان کے سینوں میں اللہ کی عظمت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبّت سرایت کئے ہوتی۔ اور وہ زندگی کے ہر موڑ پر مصائب کو مسکراتے ہوئے جھیل جاتے اور ہر آنے والے معرکہ کے لیے وہ بے چین اور بے تاب رہتے۔ بنگال سے لے کر پنجاب تک سرزمین ہند پر ان کے قدموں کے نشانات کبھی بھی مٹ نہیں سکتے۔

سیّد صاحبؒ کی شہادت ۱۸۳۱ء میں ہوئی اور اس کے ۲۸ سال بعد ہندوستان نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سامنے پوری طرح ہتھیار ڈال دیئے اور پورا ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑ گیا۔ غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوششیں بھی ناکام ہوئیں اور ہندوستانی مسلمانوں پر کرب و اضطراب کی کالی گھٹا چھا گئی اسے ہر طرف سے مایوسی ہی مایوسی نظر آ رہی تھی لیکن اللہ کو اپنے دین کی حفاظت کرنی تھی چنانچہ بڑے بڑے شہروں سے جب دینی مراکز ختم ہوئے تو قصبہ قصبہ اور قریہ قریہ چھوٹے چھوٹے مدارس قائم ہونے شروع ہوئے یہ مدارس کہیں درختوں کے نیچے اور کہیں جھونپڑوں اور چھپروں میں شروع ہوئے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ اپنی عظمت میں لال قلعہ سے بھی بڑھ گئے، انھیں مدارس سے دینی علوم کی اشاعت شروع ہوئی۔ اور ۱۸۵۷ء کے بعد تین دہائیاں بھی نہیں گذری تھیں کہ مدارس کا ایک جال بچھ گیا۔ دوسری طرف کچھ اہل فکر و نظر نے حالات کو دیکھکر مسلمانوں کو زندگی کے نئے دھاروں سے بھی آشنا کرنا شروع کیا اور ان کے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ زندگی میں کامیابی، زندگی سے فرار میں نہیں بلکہ حالات کو اپنے لیے سازگار بنانے میں پنہاں ہے۔ اس طرح ہندوستان کے مسلمان علم کے دو دھاروں سے آشنا ہونا شروع

ہوئے۔ ایک دھارا علوم اسلامیہ کا تھا اور دوسرا دھارا جدید علوم وفنون کا تھا۔ اور مسلمان دونوں دھاروں میں بٹ کر حالات کا مقابلہ کرنے لگے۔ ایک دھارے میں اصل زبان عربی تھی اور دوسرے میں انگریزی ۱۸۵۷ء تک ہندوستان کے علماء اور شعراء کی زبان اُردو اور فارسی تھی لیکن آہستہ آہستہ فارسی زبان کا دائرہ محدود ہوتا گیا اور اُردو زبان وسیع اور پر مغز ہوتی گئی۔ اور یہاں کے علماء اور مفکرین نے اسے اپنا لیا۔ اور جوں جوں اس میں علوم وفنون کی آمیزش ہوتی گئی اس کے اسلوب نگارش میں روانی اور شگفتگی پیدا ہونے لگی۔ اُردو کو آسان اور علمی بنانے میں جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ سرسیّد اور اُن کے رفقاء کا بڑا ہاتھ ہے وہاں سیّد احمد شہید کے رفقاء کی اُردو خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح اٹھارویں صدی کی چھٹی دہائی تک اُردو زبان خاص طور سے نثر نے اپنا مقام بنا لیا تھا اور تمام اہل قلم اور مسلمان اس کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنانے پر فخر محسوس کرنے لگے۔

مختلف علوم وفنون پر اس زبان میں کتابوں کی تدوین وتصنیف کا کام شروع ہوا جس میں تاریخ بھی ہے اور تذکرہ بھی۔ فلسفہ بھی ہے اور سائنس بھی۔ اس عظیم ہستی کے نقوش کی تلاش میں جو چند نقوش ملے وہ بہت ہی دھیمے اور دھندلے تھے جس پر حیرت بھی ہوتی تھی اور افسوس بھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دور کے ہندوستان کے اہل قلم ہندوستان کے ماضی قریب کی دعوت وعزیمت کی تاریخ مرتب کرنے سے گریزاں ہیں۔ کیونکہ ان کے دلوں پر انگریزوں کی ہیبت طاری ہے اور ہر اس تحریک میں جہاں جہاد اور دعوت کا ذکر ہوتا اسے فتنہ اور بغاوت پر محمول کیا جاتا۔ شاید یہی خوف وہراس سیّد احمد شہیدؒ کی تذکرہ نگاری کی راہ میں حائل رہا۔ لیکن بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے بعد اس سرزمین میں ایسے لوگ پیدا ہونا شروع ہوئے جن کی زندگی کا مقصد مسلمانوں کے اندر امید اور اعتماد کی روح پھونکنی تھی اور حق کی راہ میں خود کو قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ اس لیے انھوں نے جب یہ کام اپنے ذمّہ لیا تو اسلامی تاریخ کے شہبازوں کو نمونے کے لیے پیش کیا اور سب سے پہلے ادیبانہ اور عالمانہ شان میں جس نے مسلمانوں کے ماضی کی تاریخ کو درخشاں بنا کر اور شہیدانِ حق کے خون کو چمکتا ہوا دکھا کر پیش کیا وہ ہیں مولانا ابوالکلام آزاد۔ اور ان کا یہ کارنامہ بعد میں تذکرہ کے نام سے وجود میں آیا۔ یہ تذکرہ درحقیقت

ان کی اپنی آپ بیتی ہے لیکن اس میں انھوں نے اسلامی تاریخ کے عظماء و مصلحین کے کارناموں کا تذکرہ شروع کیا تو اپنے کو بھول گئے اور کتاب کا اکثر و بیشتر حصہ ان کی کہانی سے بھر گیا۔ اور ایسا اسلوب وجود میں آیا جس کے ہر لفظ سے زندگی، عظمت اور شوکت مترشح ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ماضی کی عظیم ہستیوں کی صحیح تصویریں فنکار کے قلم کی بدولت صفحۂ قرطاس پر بولتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ تذکرہ میں ابوالکلام آزاد نے مصلحین و مجددین کی تاریخ امام حسینؓ سے شروع کی اور ابن حنبلؒ، ابن تیمیہؒ، شیخ سرہندیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ذکر کرتے سید احمد شہیدؒ بریلوی تک پہونچے۔ اور اس طرح اس کا خاتمہ کیا جو خِتَامُہٗ مِسْکٌ کے مترادف ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کا ذکر کرنے کے بعد وہ سید احمد شہیدؒ کا تذکرہ اس طرح فرماتے ہیں۔

پھر چند قدم اور آگے بڑھو، مقام عزیمت و دعوت کی کیسی کامل و آشکارا مثال سامنے آتی ہے۔ ساری مثالوں سے آنکھیں بند کرلو، صرف یہی ایک مثال زیر بحث حقیقت کے فہم و کشف کے لیے کافی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام ہر رنگ میں کس درجہ جامع و کامل ہے۔ بایں ہمہ یہاں جو کچھ ہوا تجدید و تدوین عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا کام کام تو کسی دوسرے ہی مرد میدان کا منتظر تھا اور معلوم ہے کہ توفیق الٰہی نے یہ معاملہ صرف حضرت علامہ و مجدد شہید رضی اللہ عنہ کے لیے مخصوص کردیا تھا۔ خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا۔

می خواست رست خیزِ عالم برآورد آں باغباں کہ تربیت ایں نہال کرد

اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو انھیں کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔ حضرت پیر انصاری صاحب کا قول یاد رہے "من مرید خرقانی ام لیکن اگر خرقانی دریں وقت می بود با وجود پیریش مریدی می کرد"۔ شاہ صاحب نے مزاج وقت کے عدم تحمل و استعداد سے ہو کر بحکم

بہ رمز نکتہ ادا می کنم کہ خلوتیاں سر سبو بکشاند و در فرو بستند

دعوت و اصلاح امت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن کردیئے گئے تھے اب اس سلطان وقت و سکندر اعظم کی بدولت شاہجہان آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا۔ اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گذر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کے

کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی وہ اب بر سر بازار کی جا رہی اور ہو رہی تھی اور خون شہادت کے چھینٹے صرف احکامات کو نقوش رسوا بنا کر صفحۂ عالم پر ثبت کر رہے تھے۔

آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

پھر کیا اس وقت ہندوستان علم و عمل سے خالی ہو گیا تھا یا حق پر چلنے والے اور حق کا درد رکھنے والے معدوم ہو گئے تھے۔ کون ہے جو ایسا کر سکتا ہے۔ خود اس خاندان عالی میں کیسے کیسے اکابر و اساتذہ علم و عمل موجود تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے درس و تدریس کی بادشاہیت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم و عمل کے آفتاب تھے۔ خاندان سے باہر اگر ان کے تربیت یافتوں کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں ان کا فیضان علم کام نہ کر رہا ہو۔ بایں ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ جو وقت کا ایک سب سے بڑا کام تھا اس کے لیے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی سب دوسرے دوسرے کاموں میں رہ گئے۔ یا حجروں کا کام یا مدرسوں کا۔ لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی نہ بن آیا۔ وہ گویا ایک خاص پہناوا تھا جو صرف ایک ہی جسم کے لیے تھا اور ایک ہی پر چست آیا۔ دنیا اس کے لیے خلعت عظمت اور تشریف قبول کا ندھے پر ڈالے منتظر کھڑی تھی۔ زمانہ اپنے سارے سامانوں کے ساتھ کب سے اس کی راہ تک رہا تھا۔ امیدوار پر امیدوار یکے بعد دیگرے گذرتے رہے مگر اس کا مستحق کوئی نہ نکلا۔

بارے غمے او بہر کس کہ نمودم عاجز شد و ایں قرعہ بنامم نہ سر افتاد

تو یہ وہی حقیقت ہے کہ کتنی دیر سے تمہارے ذہن نشین کرا رہا ہوں۔ یعنی اس وادی کا مرد کار ہر صاحب علم و عمل نہیں ہو سکتا۔

مرے ایں راہ را نشانے دگر است

استادی و شاگردی نوعمری و کہولت خانقاہوں کی دھوم دھام اور مدرسوں کا ہنگامہ یہ ساری باتیں یہاں کے لیے بیکار ہیں۔ ان سارے عہدوں میں دیکھو۔ باعتبار علم و عمل ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر موجود تھا۔ تاہم دعوت دوسری چیز ہے اور عزیمت دعوت کا مقام دوسرا۔ اس کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ گڑھیوں کا محاصرہ کر لینا آسان ہے مگر قلعوں اور ملکوں کی تسخیر کی دھن دوسری ہے۔ ایک شخص کتنا ہی بڑا امیر الامراء ہو لیکن پھر امیر ہے، بادشاہوں کا عزم اور محل شاہی میں پلے

ہوؤں کا دماغ کہاں لا سکتا ہے۔

نہ ہر کہ طرف کلہ کج نہاد و تند نشست کاہ داری و آئین سرداری داند

بڑوں بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سروسامان و اسباب کا فراہم نہیں لیکن وقت کا عازم و فاتح اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا اور اگر سروسامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کر لوں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیے اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے، اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہو گئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیے اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ، درختوں کو دوڑنا چاہیے، اگر دشمن بے شمار ہیں تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں، اگر رکاوٹیں و مشکلیں بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہو گیا کہ راہ صاف نہیں کرتے۔ وہ زمانہ کا مخلوق نہیں ہوتا تاکہ زمانہ اس سے اپنی چاکری کرائے وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے اور زمانے کے حکموں پر نہیں چلتا بلکہ زمانہ آتا ہے تاکہ اس کی جنبش لب کا انتظار کرے۔ وہ دنیا پر اس لیے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا ہے جس سے دامن بھر لوں وہ یہ دیکھنے کے لیے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں جس کو پورا کر دوں۔ اس کا مایۂ خمیر بخشش و نوال ہے طلب و سوال نہیں اس کی نظریں طاق کی بلندی نہیں ناپتیں ہمیشہ اپنے ہاتھ کی رسائی اور قد کی بلندی دیکھتی رہتی ہیں، اس کا فغان عجز و ناامیدی یہ نہیں ہوتا۔

کمند کوتہ و بازوے سست و بام بلند بمن حوالہ دلو میدیم گنہ گیرند

بلکہ ہمیشہ اس شہ کامران و جزیۂ ملوکی سے غلغلہ انداز عالم و عالمیان ہوتا ہے۔ ستاروں سے تمام فضائے سمائی بھری پڑی ہے لیکن دم دار ستارے ہمیشہ طلوع نہیں ہوتے ہیں۔ یہی حال اصحاب عزائم کا بھی ہے۔ وہ کائنات ہستی کا ایک بالکل الگ گوشہ ہے اور وہاں کے احکام و قوانین کو دنیا کے اعمال عادیہ پر قیاس کرنا غلطی ہے۔ ان کی قوتیں، ان کے وسائل غیر مختتم، ان کی ترقیاں لازوال ان کے تمام طریقے غیر مختتم ہوتے ہیں۔ اللہ کی حکمت ربوبیت ان کو تمام خلق اللہ میں چن لیتی ہے اور بحکم وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ان رحمتوں اور ربوبیتوں کے عجائب و خوارق ان کے لیے مخصوص کر دیتی ہے۔ پھر ان کے معاملات میں نہ تو کسی دوسرے کا ساجھا ہوتا ہے نہ کسی مدعی کی وہاں تک رسائی۔[1]

---

[1] آزاد، تذکرہ ص ۳۷۰-۳۷۳

یہ اقتباس ہم نے تذکرہ سے پیش کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ہم یہ دکھائیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد سید احمد شہید سے کتنا متاثر تھے جس کا اثر اس اقتباس کی ہر عبارت سے مترشح ہوتا ہے۔ مولانا آزاد بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے بعد مسلمانوں کے اندر جوش اور ہمت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اس لیے انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے لے کر ہر زمانہ کی ممتاز شخصیتوں کا اس انداز میں ذکر کیا کہ پڑھنے والے کے دل سے نا امیدی، مایوسی اور تاریکی ختم ہو اور وہ ستاروں کی طرح رواں دواں اور گنگ دجمن کی طرح امنڈتا ہوا ہر معرکہ کی طرف آگے بڑھے اور اس کے اندر دوسروں سے لینے کے بجائے دینے کا حوصلہ پیدا ہو۔

سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے اثرات ہم تذکرہ کے علاوہ مولانا کے دوسرے مضامین و مقالات جو الہلال اور البلاغ کے صفحات پر شائع ہوئے تھے، ان میں بھی ہم وہی دھن اور وہی ساز اور سوز محسوس کرتے ہیں۔ اور سب سے حیرت کی بات یہ کہ مولانا کے ساتھ اس میدان میں جو بھی آئے اور الہلال والبلاغ میں مولانا کے معاون اور شریک ہوئے انھوں نے بھی مولانا کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش کی اور انھیں کے ساز پر اپنے قلم کو چلایا۔ مولانا اسی انداز میں لکھتے رہے ہندوستان کے مسلمانوں کو زندگی کا پیغام دیتے رہے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے بعد جب ہندوستان میں آزادی کی تحریک سارے ہندوستانیوں کی طرف سے اٹھی اور انگریزوں کے خلاف سب نے متحد ہو کر اسے وطن چھوڑنے کے لیے کہا تو اس وقت مولانا نے مسلمانوں ہی کی خاطر اپنے کو اس تحریک میں شامل کر لیا اور اس کے میر کارواں بن گئے۔ وہ مسلمانوں کو ہندوستان میں آزادی کی تحریک میں کسی سے بھی پیچھے دیکھنا نہیں چاہتے تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی پیشانی پر یہ داغ لگ جائے کہ وہ دشمن کے مقابلہ سے پیچھے ہٹ رہے ہیں اور بزدلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اس لیے اس مرحلہ کے بعد مولانا کی تحریروں کا انداز دوسرا تھا۔ لیکن قدرت کو سید احمد شہیدؒ کی تحریک کو ہندوستان میں زندہ و جاری رکھنا تھا اس لیے جس تحریک کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے زور قلم سے آگے بڑھایا تھا اس تحریک کو اور سید احمد شہیدؒ کی فکر کو ہندوستان کے ایک دوسرے فرزند جو اپنی ذہانت اور محنت میں ضرب المثل تھا اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس کی بھی دھن وہی تھی لیکن اس میں کڑک نہیں تھی اس میں خاموشی کے ساتھ ساتھ بڑی گہرائی و گیرائی تھی۔ وہ ہے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات۔ چنانچہ اس فکر اور مقصد کی خاطر انھوں نے ایک تفصیلی مقالہ لکھا جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ وہ ہے تجدید و احیائے دین۔ اس کتاب میں مولانا نے قرن اولیٰ سے لیکر اٹھارویں صدی کے مجددین و مفکرین کے اعمال اور افکار کا عالمانہ انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ اور مقالہ کی آخری منزل رائے بریلی کے فرزند سید احمد شہیدؒ ہی ہوتے ہیں۔ اس میں بھی وہی نظریات و تصورات ہیں جن کو ابوالکلام نے پیش کیا ہے۔ صرف انداز بیان بدل جاتا ہے اس طرح فکر احمد شہیدؒ ایک نئے روپ اور ایک نئی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ہم ان کے مقالہ کا کچھ اقتباس یہاں پیش کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گذری تھی کہ ہندوستان میں ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جس کا نصب العین وہی تھا جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کر کے رکھ گئے تھے۔ سید صاحب کے خطوط اور ملفوظات اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی منصب امامت، طبقات، تقویۃ الایمان اور دوسری تحریریں دیکھئے دونوں جگہ وہی شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی زبان بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔ شاہ صاحب نے عملاً جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ حدیث اور قرآن کی تعلیم اور اپنی شخصیت کی تاثیر سے صحیح الخیال اور صالح لوگوں کی کثیر تعداد پیدا کر دی۔ پھر ان کے چاروں صاحبزادوں نے خصوصاً شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس حلقہ کو بہت وسیع کیا، یہاں تک کہ ہزارہا ایسے آدمی ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے جن کے اندر شاہ صاحب کے خیالات نفوذ کیے ہوئے تھے۔ جن کے دماغوں میں اسلام کی صحیح تصویر اتر چکی تھی اور جو اپنے علم و فضل اور اپنی عمدہ سیرت کی وجہ سے عام لوگوں میں شاہ صاحب اور ان کے حلقہ کا اثر قائم ہونے کا ذریعہ بن گئے۔ اس چیز نے اس تحریک کے لیے گویا زمین تیار کر دی جو بالآخر شاہ صاحب ہی کے حلقہ سے بلکہ یوں کہئے کہ ان کے گھر سے اٹھنے والی تھی۔

سید صاحبؒ اور شاہ اسمٰعیل صاحبؒ دونوں روحاً و معنیً ایک وجود رکھتے ہیں اور اس وجود متحد کو میں مستقل بالذات مجدد نہیں سمجھتا بلکہ شاہ ولی اللہ کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہوں۔ ان حضرات کے کارنامے کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) انھوں نے عامۂ خلائق کے دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور جہاں

جہاں ان کے اثرات پہونچ سکے وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔

(۲) انھوں نے اتنے وسیع پیمانہ پر جو انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان جیسے برسر تنزل ملک میں بمشکل ہی ممکن ہو سکتا تھا، جہاد کی تیاری کی اور اس تیاری میں اپنی تنظیمی قابلیت کا کمال ظاہر کردیا۔ پھر غایت تدبر کے ساتھ آغاز کار کیلئے شمال مغربی ہندوستان کو منتخب کیا جو ظاہر ہے کہ جغرافیائی و سیاسی حیثیت سے اس کام کے لیے موزوں ترین خطہ ہوسکتا تھا۔ پھر اس جہاد میں ٹھیک وہی اصول، اخلاق اور قوانین جنگ استعمال کیے جن سے دنیا پرست جنگ آزما کے مقابلہ میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ ممتاز ہوتا ہے اور اس طرح انھوں نے دنیا کے سامنے پھر ایک مرتبہ صحیح معنوں میں روح اسلامی کا مظاہرہ کردیا۔ ان کی جنگ ملک ومال، یا قومی عصبیت یا کسی دنیوی غرض کے لیے نہ تھی بلکہ خالص فی سبیل اللہ تھی۔ ان کے سامنے کوئی مقصد اس کے سوا نہ تھا کہ خلق اللہ کو جاہلیت کی حکومت سے نکالیں اور وہ نظام حکومت قائم کریں جو خالق اور مالک الملک کے منشاء کے مطابق ہے۔ اس غرض کے لیے جب وہ لڑے تو حسب قاعدہ اسلام یا جزیہ کی طرف پہلے دعوت دی اور پھر اتمام حجت کرکے تلوار اٹھائی اور جب تلوار اٹھائی تو جنگ کے اس مہذب قانون کی پوری پابندی کی جو اسلام نے سکھایا ہے، کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ فعل ان سے سرزد نہیں ہوا۔ جس بستی میں داخل ہوئے مصلح کی حیثیت سے داخل ہوئے نہ کہ مفسد کی حیثیت سے۔ ان کی فوج کے ساتھ نہ شراب تھی، نہ بینڈ بجتا تھا، نہ بیسواؤں کی پلٹن ہوتی تھی، نہ ان کی چھاؤنی بدکاریوں کا اڈہ بنتی تھی اور نہ ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ ان کی فوج کسی علاقہ سے گذری ہو اور اس علاقہ کے لوگ اپنے مال اور اپنی عورتوں کی عصمتیں لٹنے پر ماتم کناں ہوں۔ ان کے سپاہی دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اور رات کو جانماز پر ہوتے تھے۔ خدا سے ڈرنے والے، آخرت کے حساب کو یاد رکھنے والے اور ہر حال میں راستی پر قائم رہنے والے تھے، خواہ اس پر قائم رہنے میں ان کو فائدہ پہونچے یا نقصان انھوں نے کہیں شکست کھائی تو بزدل ثابت نہ ہوئے اور کہیں فتح پائی تو جبار اور متکبر نہ بنے گئے۔ اس شان کے ساتھ اسلامی جہاد ہندوستان کی سرزمین میں نہ اسے پہلے ہوا تھا اور نہ ان

کے بعد ہوا۔

(۳) ان کو ایک چھوٹے سے علاقہ میں حکومت کرنے کا جو موقع ملا، انھوں نے ٹھیک اسی طرز کی حکومت قائم کی جس کو خلافت علی منہاج النبوۃ کہا گیا ہے۔ وہی فقرانہ امارت، وہی مساوات، وہی شوریٰ، وہی عدل وانصاف، وہی حدود شرعیہ، وہی مال کو حق کے ساتھ لینا اور حق کے مطابق صرف کرنا، وہی مظلوم کی حمایت اگرچہ ضعیف ہو اور ظالم کی مخالفت اگرچہ قوی ہو، وہی خدا سے ڈر کر حکومت کرنا اور اخلاق صالح کی بنیاد پر سیاست چلانا، غرض ہر پہلو میں انھوں نے اس حکمراں کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا جو صدیقؓ اور فاروقؓ نے کی تھی[1]

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں جب ہم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تمام تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں پوری طرح یقین ہو جاتا ہے کہ مولانا کی تحریریں سیّد احمد شہیدؒ کی پوری طرح ترجمانی کر رہی ہیں اور جن جن چیزوں پر اس تحریک میں زور دیا گیا اس کو مولانا نے اپنی مختلف تصانیف میں تفسیر اور توضیح کی ہے۔ رسالۂ دینیات، خطبات اور دوسرے چھوٹے چھوٹے رسائل میں انھوں نے رسالت نبوّت، اتّباع سنّت، حقیقت دین اور بدعات و خرافات سے اجتناب پر زور دیا ہے اور ان کی سب سے اہم کتاب جو اردو زبان ہی میں نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی ایسی کتاب علمی انداز میں نہیں لکھی گئی وہ ہے الجہاد فی الاسلام سیّد احمد شہید کی تحریک کا سب سے اہم عنصر جہاد تھا لیکن یہ عنصر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے ذہن میں دھیما ہوتا جا رہا تھا اور وہ طاقتیں جو اپنی سفاکی اور بے رحمی میں چنگیز و ہلاکو کو مات کئے ہوئے تھیں ہندوستان کے پژمردہ اور بے کس مسلمانوں کے ذہن میں مختلف ذرائع سے یہ بات پیدا کر رہی تھیں کہ اسلام دنیا میں بزور تلوار پھیلا اور اسلام کے ساتھ ساتھ بے رحمی و سفاکی اور قتل و غارت گری لازم و ملزوم ہیں۔ اس بحرانی دور میں جب لوگوں کے قلم جہاد کے موضوع پر لکھنے سے تھرتھراتے تھے اس دور میں ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک کتاب لکھ کر بہت بڑا فریضہ انجام دیا اور سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک کے اس عنصر کو ہندوستان کے مسلمان

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ تجدید و احیائے دین ص ۱۰۶ ـ ۱۰۹

نوجوانوں کے ذہن میں تازہ کیا۔ اور دوسرا عنصر جو احمد شہیدؒ کی تحریک میں بہت نمایاں نظر آتا ہے وہ ہے ایک دینی و اسلامی حکومت کا قیام۔ چنانچہ ابوالاعلیٰ مودودی نے اس عنصر کو اپنی تحریک کا مرکز و محور بنایا۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو سیّد احمد شہیدؒ کی فکر ابوالاعلیٰ مودودی کی تمام تحریروں میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اور اس طرح اُردو نثر نگاری نے اس تحریک کی بدولت ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک اسلوب اُردو زبان میں چھوڑا جو مدّتوں زندہ اور قابل نمونہ رہے گا۔

قدرت جب کسی تحریک کو اور آگے بڑھانا اور عام کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے کچھ اور ایسے لوگوں کا انتخاب کرتی ہے جو ذہن اور فکری طور پر اس تحریک سے ہم آہنگ ہوں۔ اس طرح اس تحریک کو ایک نئے انداز، نئے فکر، نئے زاویہ سے پیش کرنے کے لیے قدرت نے احمد شہیدؒ کے خانوادے کے ایک فرزند کا انتخاب کیا وہ ہیں مولانا سیّد ابوالحسن علی الندوی جنھوں نے جب ہوش سنبھالا، اس وقت سے ان کے کانوں میں اپنے جدامجد کے کارنامے گونج رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنے اعزہ و اقربا کے یہاں جاتے تو ان کے یہاں بھی ان کی کہانی اور داستان سنتے۔ اس طرح احمد شہیدؒ کے نام اور ان کے کام سے ان کو بچپن ہی سے لگاؤ اور عشق پیدا ہوا۔ چنانچہ ہندوستان کی تاریخ میں وہ پہلے ادیب اور محقق ہیں جو سیّد احمد شہیدؒ کے قدموں کے نشانات ہندوستان کے طول و عرض میں تلاش کرنے لگے اور جہاں بھی ان کے قدموں کے نشانات کا ان کو سراغ لگتا تو وہاں وہ رکتے اور اس کے ذرّوں کو سینہ سے لگا لیتے۔ گویا ابوالعلا المعری کا یہ شعر

خفف الوطأ ما أظن أديم الارض الا من هذه الاجساد

ان پر صادق آتا۔

مولانا جب احمد شہیدؒ کے قدموں کے نشانات کو تلاش کرتے تو ایک طرف ان کے دل میں اس ذات اقدس سے محبت کی آگ بھڑکتی تو دوسری طرف ان کے دل میں اسلامی حمیت بھی موجزن ہوتی۔ ان دونوں عناصر کے امتزاج سے مولانا نے سیرت سیّد احمد شہیدؒ کی تدوین و تصنیف کا کام شروع کیا۔ یہ کام اُردو ادب کے لیے ایک نادر تحفہ ہے

تو دوسری طرف تحقیق کا ایک اعلیٰ نمونہ بھی۔ مولانا کی یہ جوانی کی تصنیف ہے جس میں تاریخی بصیرت بھی ہے اور زبان کی بلاغت بھی۔ اس کے بعد مولانا کا قلم مسلسل رواں دواں رہا اور ہزاروں صفحات پر مشتمل ان کے افکار و نظریات پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن میری حقیر رائے میں مولانا کی یہ پہلی تصنیف جہاں زبان و بیان کا اعلیٰ شاہکار رہے وہیں تصنیف و تالیف کا بھی اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا نے جب یہ کتاب لکھی اس وقت ان کے اندر جوانی کا جوش و امنگ اور سیّد احمد شہیدؒ سے والہانہ لگاؤ اور عقیدت تھی۔ اور شاید یہ شعر

ذکر اس پری وش کا پھر بیان اپنا

پوری طرح صادق آتا ہے۔

سیرت سیّد احمد شہیدؒ کے ذریعہ مولانا نے سیّد احمد شہید کی زندگی کے ہر گوشہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح فکر احمد شہیدؒ اس کتاب کے ہر ہر صفحہ میں رواں دواں ہے۔ اس کتاب کی تصنیف و ترتیب کے بعد مولانا کے ذہن میں سیّد احمد شہیدؒ کی تجدیدی کاوشوں کو دوسرے انداز میں پیش کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ انھوں نے اس فکر کو اعلیٰ تصنیفی معیار پر پیش کرنے کی کوشش کی اور یہ سلسلہ تاریخ دعوت و عزیمت کے نام سے شروع ہوا۔ جو عمر بن عبدالعزیز سے شروع ہوتا ہے اور سترہویں صدی کے مجدد اور مفکر شاہ ولی اللہ تک پہونچا ہے۔ یہ تصنیفی عمل جہاں تاریخی اعتبار سے اعلیٰ نمونہ ہے وہیں اردو نثر نگاری کے لئے بھی نیا موڑ ہے۔ مولانا قدرۃً ادیب ہیں، ان کا مزاج شاعرانہ ہے۔ تصوّف کا ان کی زندگی پر کافی اثر ہے قرآن کی زبان اور اس کے رموز سے انھیں عشق ہے۔ اس لیے جب وہ ان موضوعات پر لکھتے ہیں تو ان کے اندر الہامی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ان کا اسلوب مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بیچ کی ایک شکل اختیار کرتا ہے۔ وہ فکر کے ساتھ ساتھ الفاظ کے جادو کے بھی شیدائی ہیں اور اپنی تحریروں کو وجدانی کیفیت سے بھر دیتے ہیں۔ اس طرح احمد شہیدؒ کی تحریک کے اثرات مولانا کی ذات سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیلے اور مولانا کے حلقہ کے بہت سے نوجوانوں نے اس فکر کو اپنایا

(باقی صفحہ ۱۶۷ پر)

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سید احمد شہیدؒ کی

تفسیر سورۂ فاتحہ اور اس کا اسلوب

حضرت سید احمد شہیدؒ (۶ صفر ۱۲۰۱ھ / ۲۸ نومبر ۱۷۸۶ء تا ۲۴ ذوقعدہ ۱۲۴۶ھ / ۶ مئی ۱۸۳۱ء) کے نامور سوانح نگاروں اور ان کی تحریک کا جائزہ لینے والوں نے ان کی تصانیف کے ضمن میں کسی اردو رسالے یا کتابچے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ صرف مولانا محمد عبدالحلیم چشتی نے اس اہم موضوع پر اپنے دو مضامین میں روشنی ڈالی ہے اور یہ دونوں مضامین اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ وہ حضرت سید احمد بریلویؒ کے دو اردو کتابچوں حقیقت الصلوٰۃ اور تفسیر سورہ فاتحہ کو پہلی بار روشناس خلق کرتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ یہ دونوں رسالے کلکتہ سے ۱۲۴۷ھ میں مولوی بدر علی کے چھاپے خانے میں طبع ہو کر شائع ہو چکے تھے مگر وہ عام اہل علم کی نگاہ سے اوجھل رہے، اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مولانا چشتی موصوف کے مذکورہ بالا مضامین کو عام طور سے درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا اور غالباً یہی سبب ہے کہ جدید مطبوعات و مضامین میں بھی سید احمد شہیدؒ کے ان اردو رسالوں کا کوئی ذکر یا حوالہ نہیں ملتا۔ سید احمد صاحبؒ کے ان دونوں رسالوں کی زبان و اسلوب کے لحاظ سے بھی اہمیت ہے اور فکر و نظر کے اعتبار سے بھی۔

ایسا نہیں ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ سورۂ فاتحہ یا بعض دوسری سورتوں کے اولین مترجم تھے یا ان کی تفسیر سب سے قدیم ہے۔ اولیت و سبقت کا شرف تو حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کو بھی حاصل نہیں ہے جو عام طور سے ان کے سر باندھا جاتا ہے، بلکہ تاریخ کی شہادت تو کسی گمنام بندۂ خدا کے حق میں جاتی ہے جس نے رضائے الٰہی کی خاطر پہلی بار اس برصغیر میں زبانِ عوام اردو/ہندی

میں قرآن کریم یا اس کی سورتوں کا ترجمہ و تفسیر کی تھی۔ ہماری موجودہ معلومات کے مطابق یہ سلسلۂ زریں سرزمین ہند میں پہلے اسلامی قدم کے ساتھ شروع ہوا تھا کیونکہ پیغام الٰہی کا تقاضا بھی یہی تھا اور تشنگانِ علم و معرفت کی طلب بھی یہی تھی۔ کسی ہندوستانی زبان میں ترجمہ و تفسیر قرآن کریم کا پہلا تاریخی ثبوت ۲۷۰ھ ۸۸۳ء سے متعلق ملتا ہے جب کشمیر کے راجہ مہروک کے لیے ایک گمنام عالم نے ترجمہ و تفسیر کی خدمت انجام دی تھی۔ امکان اس سے پہلے بھی ترجمۂ قرآن ہونے کا ہے مگر اس کے بعد تو ہندوستانی زبان میں تراجم و تفاسیر قرآن کا ایک اٹوٹ سلسلہ نظر آتا ہے۔ محققین نے اٹھارہویں صدی عیسوی سے پہلے کے کم از کم تین مکمل تراجم و تفاسیر اور متعدد جزوی ترجمے تلاش کیے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ دہلوی کے ترجمہ و تفسیر سے قبل کے متعدد ترجموں اور تفسیروں کا بھی پتہ چلا ہے اور اب ان کے مخطوطات ملک کی مختلف لائبریریوں میں دستیاب ہیں۔ سید احمد شہیدؒ بھی اسی سلسلۂ زریں کی ایک اہم کڑی ہیں جو اپنے پیش رؤں اور جانشینوں سے زمان و مکان کے دو سروں پر جڑے ہوئے ہیں اور ان کے ترجمہ و تفسیر سورۂ فاتحہ کی اہمیت و مقام کا اسی وقت اندازہ ہو سکتا ہے جب کہ فکر و زبان، اسلوب و ادا کے لحاظ سے متقدمین اور متاخرین علماء اور مفسرین کے کام سے اس کا موازنہ و مقابلہ کیا جائے۔

تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت سید احمد شہیدؒ نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر و ترجمانی غالباً سب سے پہلے ۱۲۳۵ھ میں لکھنؤ میں بعض جید علماء کرام کی موجودگی میں کی تھی اور اس سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے اس کی شہادت مولانا محمد اشرف بن نعمت اللہ لکھنوی (متوفی ۱۲۴۴ھ) نے بھی دی ہے۔ مولانا محمد عبدالحلیم چشتی نے اس ضمن میں حضرت سید شہید کی تفسیر کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ "یہ تفسیر اپنی سلاست اور روانی میں شاہ عبدالقادر کی موضح القرآن کے بعد اردو زبان میں دوسری کوشش ہے۔ جس طرح شاہ دہلویؒ نے ایجاز سے کام لیا ہے اسی طرح سید شہیدؒ نے بھی ایجاز سے کام لیا ہے۔ یہ ترجمہ و تفسیر نہ تو یا اردوئے معلیٰ کے بجائے ہندی یا عوامی زبان میں ہے۔ سید شہیدؒ نے بول چال کی زبان استعمال کی ہے اور روزمرہ کو نہیں چھوڑا ہے۔ یہ تفسیر موضوع اور انداز بیان دونوں اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام کو دینی باتوں کے سمجھانے کے لیے عام فہم، سلیس اور ٹھیٹ اردو میں مختصر رسالے لکھنے کی داغ بیل سب سے پہلے سید احمد شہیدؒ

ہی نے ڈالی تھی جس کو ان کے خلفاء اور مریدان با اخلاص نے پروان چڑھایا۔ یہ تفسیر و ترجمہ نہ صرف سید شہیدؒ کے انداز بیان و طرز ادا کا پتہ دیتا ہے بلکہ ان پر شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے اثر فکر و زبان و ادا کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ اور آخری بات یہ کہ "سید احمد شہیدؒ اور ان کے خلفاء نے جہاں اسلام کی صحیح ترجمانی کی ہے وہاں ان خاصانِ خدا نے اردو زبان کو بھی بڑی ترقی دی ہے۔"

سید احمد شہیدؒ نے بسملہ کے بعد سورہ فاتحہ کی حقیقت سے آغاز کیا ہے اور اس کو دوسرے مفسرین کی مانند طریق دعا قرار دیا ہے۔ مگر ان کی تعبیر و تشریح بڑی اچھوتی ہے اور ترجمہ بھی عمدہ غالباً سب سے بہتر ہے۔ مگر یہ دل چسپ اور اہم بات ہے کہ سید شہیدؒ نے نہ تو بسملہ کا ترجمہ کیا ہے اور نہ اس کی تشریح و تفسیر کی ہے۔ البتہ حقیقت الصلوٰۃ میں بسملہ کا ترجمہ یوں کیا ہے: "شروع اللہ کے نام سے جو مہربان ہے رحم والا ہے۔" مگر یہاں بھی اس کی تفسیر و تشریح نہیں فرمائی ہے۔ بسملہ کے بعد وہ آغاز کلام یوں کرتے ہیں:

"اس سورے میں اللہ نے دعا کی طرح بتلائی، اور اللہ کے بتلائے برابر کسی کا بتلایا نہیں ہوتا اس واسطے یہ سورت بڑی بزرگی رکھتی ہے۔"

حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ موضح القرآن میں فرماتے ہیں کہ "یہ سورت اللہ صاحب نے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ اس طرح کہا کریں۔" شاہ صاحب نے اسی پر اقتصار کیا ہے اور مزید تشریح و تعبیر نہیں فرمائی، جبکہ سید شہید نے اپنی اس تفسیر میں سب سے زیادہ اسی غایت و مقصود پر بحث فرمائی ہے۔ سر سید احمد خاں نے آغاز کلام یوں کیا ہے کہ "اس سورہ میں کچھ تو خدا کی تعریف ہے اور کچھ اپنی عاجزی اور کچھ دعا۔ پس گویا بندوں کی زبان سے کہی گئی ہے اور بلاشبہ بندوں کو خدا سے اسی طرح التجا کرنی زیبا ہے۔" دعا جب دل سے کی جاتی ہے ہمیشہ مستجاب ہوتی ہے۔" اس کے بعد سر سید مقصد دعا اور استجابت الٰہی کے مفہوم کی تشریح میں وادی عقل میں چلے گئے ہیں اور ان کی عجیب و غریب تشریح و تفسیر کی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے بسملہ کی نحوی اور صرفی بحث چھیڑ دی ہے اور بقیہ سورت کی تفسیر بھی لغوی مباحث سے بھری ہوئی ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے لکھا ہے کہ "یہ سورت رب العالمین نے اپنے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ ان الفاظ میں اپنے خالق و رازق کے سامنے عرض دعا کیا کریں۔" اور پھر اسی کی مزید تفصیل و تشریح کی ہے۔ معاصر علماء میں

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی اور بقیہ تمام مفسرین کرام نے کم و بیش یہی بات کہی ہے۔ لیکن جس خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ سید احمد شہیدؒ اس کی ترجمانی و تفسیر کرتے ہیں وہ انھیں کی زبان سے سننے کے لائق ہے:

"اور دعا میں دستور یوں ہے، ہر کوئی جانے ہے کہ باوجودیکہ سب آدمی محتاج بے مقدور ہیں پر سوال کرنے میں جو آدمی سخی کریم باہمت اور با مقدور ہوتا ہے اس سے مانگتے ہیں۔ جتنا تفاوت آدمیوں میں اوصاف سے ہوتا ہے اتنا ہی سوال کرنے میں فرق پڑتا ہے۔ جس میں سخاوت نہ ہو اس سے نہیں مانگتے اور جو سخاوت ہو پر ترش روئی بھی ہو تو اس سے بھی مانگنے میں پرہیز کرتے ہیں۔ اور جو ترش روئی بھی نہ ہو بہت خلق ہو پر دینے کے پیچھے اترا دے، جتلا دے، منت رکھے اس سے بھی مانگنا اچھے آدمیوں کو سخت بھاری ہوتا ہے۔ اور جو بے مقدور ہو تو اس سے مانگنا ہی نہیں ہو سکتا اور جتنے یہ اوصاف کمال پر ہوں اتنا مانگنا اس سے خوب ہوتا ہے یہاں تک کہ مانگنا عزت ہو جاتا ہے۔ اور سوال کرنے میں آدمی اول وہ صفتیں اور خوبیاں بیان کرتا ہے کہ جس سے سوال رد نہ ہو۔ اور ایسا کہتا ہے کہ جس سے سوال کرے وہ بھی مان لے اور اقرار کرے کہ ہاں میں ایسا ہی ہوں اور تیرا کہنا سچ ہے، تو بھی دل کے اعتقاد سے کہتا ہے۔ جب یہ سب ہو کر سوال ہوتا ہے تو ہرگز وہ سوال رد نہیں ہوتا بلکہ سوال کرنا واجب ضرور ہو جاتا ہے۔ ایسے سخی اور کریم، اور اس سے ملنا بھی ایسا یقین ہوتا ہے جیسا اپنے ہات میں لے لیا۔ جب آدمی کا احوال معلوم کرے کہ آدمیوں میں ایسا ہو پھر اللہ کی ذات پاک کو کہ جس کی تمثیل نہیں ہو سکتی سمجھے اور مالک، خالق اور مخلوق کا فرق بوجھے کہ جب بندہ مخلوق ایسا ہو تو وہ مالک خالق کس درجے میں ان خوبیوں کو سچے دل سے سمجھ کر کہے ایسا کہ ادھر سے جواب پاوے سچ یوں ہی ہے اور تیرا کہنا سچا ٹھیک ہے، پھر اس کے پیچھے سوال ضروری ہے اور اس کا رد نہیں ہوتا، لابدی قبول ہوتا ہے۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ہر کمال اس سورے میں اپنے بندوں کو تعلیم فرمایا تو کہ حضور دل سے سمجھ کر ایسا کہیں کہ جواب پاویں، اور سوال کریں اور ایسی صفتیں اللہ کی بیان کریں کہ دل میں تہ نشیں ہو جاوے کہ ایسے اوصاف والے کی درگاہ میں ہرگز سوال رد نہیں ہوتا، ان وصفوں میں پہلے الحمد للہ ہے کہ جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام خوبیاں اسی کی ہیں غیر کی نہیں۔ فی الحقیقت وہی ہے خوبیوں والا، اس میں سب خوبیاں آگئیں۔ پھر اس کے

پیچھے کئی خاص وصفوں کو بیان کیا کہ جن سے بندے کے دل میں حضوری اور بڑی محبت چمک جاوے اور سوال کی تمہید جیسی چاہیے ویسی ہی دل میں مضبوط ہو۔ یہ اس کو ہے جو سمجھ کر کہے اور جو غفلت کرے وہ اس نعمت سے رہ جاوے۔ حاصل اتنا ہے کہ سوال مانگنا ایسا ہو کہ ضرور قبول ہو جاوے، خوبیوں کے بیان کرنے سے اور مالک کے اقرار سے کہ ہاں ایسا ہی ہوں جیسا تو کہتا ہے۔ کیا بڑا کرم اس کا ہے کہ اس نے آپ ہی بندوں کو سکھلایا کہ کہیں: الحمد للہ"۔ سید شہیدؒ اس کے بعد حمد والی آیت کا ترجمہ اور تفسیر بیان کرتے ہیں۔ ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۴ء میں سید بابا قادری بن سید شاہ محمد یوسف قادری نے اس کا ترجمہ کیا ہے: "تمام تعریفات ثابت ہے واسطے اللہ کے"۔ شاہ عبدالقادر دہلوی نے کیا ہے: "سب تعریف اللہ کو ہے"۔ سر سید نے سب بڑائیاں خدا ہی کے لیے ہیں" کیا ہے جبکہ ان کے ایک معاصر حکیم محمد شریف خاں (متوفی ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء) نے یوں ترجمہ کیا ہے: "جو تعریف کہ اوّل سے آخر تک موجود ہے لائق ہے واسطے اللہ کے"۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ میں ہے: "ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو (سزاوار) ہے"۔ معاصر مفسرین میں مولانا اشرف علی تھانوی نے: "سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں" کیا ہے۔ جبکہ مولانا دریابادی نے مولانا تھانوی کی کسی قدر پیروی کی ہے اور مولانا آزاد نے ترجمہ کیا ہے: "ہر طرح کی ستائشیں اللہ ہی کے لیے ہیں"۔ ان کے علاوہ دوسرے علماء میں مولانا مودودی نے "تعریف اللہ ہی کے لیے ہے" اور مولانا اصلاحی نے: "شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے" کیا ہے۔ غرضکہ بیشتر مفسرین نے حمد کا ترجمہ تعریف کیا ہے۔ کسی کسی نے ثناء، بڑائی وغیرہ بھی کیا۔ سید احمد شہیدؒ نے غالباً سب سے پہلے لفظ حمد کو جوں کا توں قائم رکھتے ہوئے ترجمہ کیا: "سب حمد اللہ ہی کو ہے"۔ متقدمین و متاخرین میں بہت کم حضرات نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ گلکرسٹ کی زیر نگرانی علماء کی ایک جماعت نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے لیے جو ترجمہ قرآن ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں کیا تھا اس میں اس کا ترجمہ: "ہر ایک حمد خدا کے لیے ہے" کیا گیا ہے۔ مولانا احتشام الدین مراد آبادی نے ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء میں اسی طرح ترجمہ کیا ہے: "حمد کا مستحق فقط اللہ ہے"۔

سید احمد شہیدؒ نے پھر حمد کی جو تشریح و تفسیر کی ہے وہ انوکھی ہے۔ فرماتے ہیں: "حمد کہتے ہیں نیکی اور تعریف خوب کرنے کو۔ مسلمان آدمی جب اس کو کہیں تب چاہیے کہ اس کو تحقیق

اسی طور پر سمجھ لیں اور اللہ کے سامنے اس مضمون کو کہ جسے منہ سے مجمل کہا ہے مفصل سمجھیں اور دل میں یقین لاکر اللہ کے حضور اس مفصّل کو اپنے اعتقاد موجب اثبات پہونچاویں۔ اور اثبات کرنے کی طرح دل میں یہ ہے کہ جس کی تعریف کو خیال کرے سمجھے کہ اللہ ہی کی فی الحقیقت یہ تعریف ہے مثال اس کی جیسا کسی خوب صورت کو جو بڑے درجہ کا خوبصورت ہو دیکھے اور اس کے حسن کی تعریف کرے تو غور کرے کہ اس کی تعریف جو میں کرتا ہوں اس کا حسن اس کے قابو کا نہیں اور اس نے اپنا حسن آپ نہیں کرلیا یہ اللہ نے اپنے کرم سے بنایا۔ وہ اس کا خالق ہے فی الواقع حسن کا مالک وہی ہے اور تعریف اسی کی چاہیئے۔ اس آدمی کی تعریف کرنی ایک طرح کی غفلت ہے ہر چند درست ہے۔ اور اسی طور پر حسن کی تعریف کسی چیز پر ہووے سخاوت پر، شجاعت پر سب میں یہی بات سمجھے کہ اللہ ہی کی یہ چیز ہے تو اللہ کی تعریفوں کا لحاظ کرے کہ بے شمار ہیں اور جس بندے میں کوئی وصف ہے سو وہ اسی کی ایک ادنیٰ بخشش ہے کہ اُنّے اپنے بندے کو ایک تعریف کی چیز دی ہے۔"

تقریباً تمام قدیم و جدید مفسرین نے حمد کی یہی تفسیر و تعبیر کی ہے مگر سیّد احمد شہیدؒ نے زبان سے مجمل تعریف اور دل سے مفصل حمد کا نکتہ اچھوتا پیدا کیا ہے۔ اور دوسرے مفسرین کے یہاں بالعموم نہیں پایا جاتا۔ حسن و کمال اور خوبی کا اصلی منبع ذات الٰہی اور باقی ہر چیز جو ان صفات سے متصف ہو حسن مستعار کی حامل ہوتی ہے۔ سید شہیدؒ نے اس نکتہ کی عمدہ تشریح کی ہے اور دل چسپ بات یہ ہے کہ ان کی تفسیر کی گونج مولانا آزاد اور مولانا مودودی کی تفسیروں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ رسالہ حقیقت الصلوٰۃ میں سید شہیدؒ نے اس آیت کا مختلف ترجمہ کیا ہے جو ہو بہو شاہ عبدالقادر دہلوی سے ماخوذ ہے۔ البتہ اس کی تشریح میں کچھ نہیں لکھا ہے۔

اولین آیت کے دوسرے جز رب العالمین کا ترجمہ سیّد شہیدؒ نے یوں کیا ہے: "پرورش کرنے والا ہے سارے جہانوں کا۔" جبکہ حقیقت الصلوٰۃ میں انھوں نے اپنے استاد گرامی کے ترجمہ میں لفظ ہے کا اضافہ کر دیا ہے: "جو صاحب سارے جہان کا ہے۔" پہلا ترجمہ یقیناً دوسرے سے بہتر اور الفاظ قرآنی کے زیادہ قریب ہے۔ دوسرے مفسرین نے رب کے لیے پروردگار، مالک، روزی دینے والا، بخشنے ہارا، پیدا کرنے والا، پالنے والا، تربیت کرنے والا، وغیرہ کیا ہے۔ انیسویں صدی کے

ایک مفسر حکیم سید محمد حسن امروہوی نے غایۃ البرہان میں پرورش کرنے والا کیا ہے۔ مولانا تھانوی نے مربی ترجمہ کیا ہے جبکہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی نے لفظ "رب" ہی کو بعینہٖ رکھ دیا ہے۔ عالمین کا ترجمہ اکثر قدیم مفسرین نے سارے عالم، سارے جہان، تمام جہان کیا ہے۔ البتہ کچھ حضرات نے سب کا، سب ہر ساری مخلوق کا، ترجمہ کیا ہے۔ مولانا اصلاحی کے یہاں "کائنات" مولانا مودودی کے ترجمہ میں "تمام کائنات" اور مولانا آزاد کے یہاں "تمام کائنات خلقت" ہے جبکہ مولانا تھانوی نے "ہر ہر عالم" ترجمہ کیا ہے۔ سید احمد شہیدؒ کا سورہ فاتحہ کا ترجمہ یقیناً بہتر اور اسی طرح ان کی مختصر تشریح بھی دلنشیں ہے۔ فرماتے ہیں:

"سو خدا تعالیٰ کے جو چیز کہ عالم میں ہے سب کی پرورش وہی کرتا ہے۔ پرورش کچھ کھانے پینے پر ہی موقوف نہیں۔ کھانا پینا بھی ایک پرورش ہے۔ فرشتوں کی پرورش یہ ہے کہ اللہ ان پر ایسی عنایت فرماتا ہے کہ جس سے ان کا کمال بڑھ جاوے اور خوشی زیادہ حاصل ہو، سو پرورش سے وہ بھی خالی نہیں۔ جیسے کوئی کسی آدمی کو ایسا خوش کرے یا اس پر مہربانی فرمائے کہ وہ آدمی اس کے سبب تازہ فربہ ہو جاوے یہ کھانا دینے سے بہتر ہے اور بڑی پرورش ہے۔ اللہ کی عنایت اسی طور پر ہوتی ہے۔ فرشتوں کی پرورش یونہی کرتا ہے۔

ربّ العالمین کا وصف بڑا وصف ہے کیونکہ وہ پرورش کرتا ہے تمام جہانوں کی کہ جن کا کچھ پایاں نہیں۔ دوست دشمن بھلے برے کو، بھوکوں کو بغیر سوال کے پالتا ہے۔ جو ایسا رب ہو تو وہ البتہ سوال قبول کرتا ہے۔

اس کے بعد فائدہ کے ذیلی عنوان کے تحت فرماتے ہیں: "جب مسلمان اللہ کے سامنے کھڑا ہو کر اس کی تعریف ایسی کرے کہ اسے دل سے سمجھے اور ٹھیک جانے کہ اسی طور پر ہے اس میں کچھ تفاوت نہیں فی الحقیقت وہ ایسا ہی ہے تو اللہ اس پر متوجہ ہو کر اس کا جواب آپ ارشاد فرماتا ہے کہ ہاں میں ایسا ہی ہوں اور اس بندے کو بھی جتاتا ہے۔ اس جواب پر ہر ایک بندہ اپنے مرتبے کے موافق کلام سنتا ہے یا اسے الہام ہوتا ہے یا دل کو تسکین اور قرار اور خوشی اللہ کی متوجہ ہوتی ہے اور قبول کرنے کی پائی جاتی ہے، حضور دل سے سمجھ کر سوال کرنے

کے سبب یہ بات ہوتی ہے اس میں تفاوت نہیں ہوتا۔"

عام طور پر مفسرین نے "عالم گیر ربوبیت الٰہی" کا ذکر کیا ہے۔ مولانا آزاد نے اس کے نتیجہ میں تمام تنگ نظریوں کا خاتمہ دیکھا ہے جبکہ مولانا مودودی نے مالک و آقا، مربی و پرورش کرنے والا، خبر گیری اور نگہبانی کرنے والا، فرمانروا حاکم اور مدبّر و منتظم کے تین معانی بیان کرنے پر اکتفا کی ہے اور مولانا اصلاحی نے مولانا مودودی کے بیان کردہ پہلے دو معانی پر اسے محصور کر دیا ہے۔ مگر ان مفسّرین میں سے کسی نے پرورش کی قسم و نوعیت نہیں بیان کی ہے جیسی سیّد احمد شہیدؒ نے کی ہے۔ ان کا بیان کردہ فائدہ اہل دل اور صوفیانہ خیالات کا مظہر ہے۔

آیت: الرّحمٰن الرّحیم کا ترجمہ سیّد احمد شہیدؒ نے: "بہت رحم والا ہمیشہ کو رحم کرتا ہے" کیا ہے جبکہ حقیقت الصّلوٰۃ میں انھوں نے شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ: "بہت مہربان نہایت رحم والا" قبول کر لیا ہے۔ اس کی تشریح میں وہ فرماتے ہیں:۔

"جو شخص کہ رحم اور پرورش کرتا ہے اور اس سے ہر کوئی وقت بہ وقت مانگے تو گھبرا جاتا ہے اور کبھی کبھی خفا ہو کر سخت کہنے لگتا ہے اور جھنجھلاتا ہے، اللہ کا ایسا رحم اور ہمیشہ بہت اور ہمیشہ ہے کہ اس کو کبھی کسی کے مانگنے اور پرورش کرنے سے خفگی اور جھنجھلاہٹ نہیں آتی، جتنا کوئی مانگے وہ اتنا ہی خوش ہو، اسی لیے اس نے الرّحمٰن الرّحیم فرمایا۔"

دوسرے مفسرین نے مہربان اور نہایت رحم والا اس طرح ترجمہ کیا ہے کہ گویا دونوں ایک دوسرے کے مصدق و تکمیل کرنے والے ہیں۔ مولانا مودودی نے رحیم کو رحمٰن کے لفظ سے مبالغہ ادا کرنے میں کمی رہ جانے کی تلافی کرنے والا قرار دیا ہے۔ مولانا اصلاحی "رحیم" کو تاکید مزید کے لیے لائے جانے کے خیال پر تنقید کرتے ہوئے رحمٰن کو خدا کی رحمت کے جوش و خروش کو ظاہر کرنے والا اور رحیم کو رحمت الٰہی کا دوام اور استقلال ثابت کرنے والا لفظ قرار دیتے ہیں۔ سیّد احمد شہیدؒ نے یہی بات عوامی زبان میں تقریباً ڈیڑھ صدی قبل بڑے خوبصورت انداز میں کہی تھی۔

بیشتر مفسرین کی مانند سیّد احمد شہیدؒ نے مالک یوم الدّین کا ترجمہ: "مالک ہے جزا کے دن کا" کیا ہے جبکہ حقیقت الصّلوٰۃ میں انھوں نے شاہ عبدالقادر کا ترجمہ: "مالک انصاف کے دن کا"

قبول کیا ہے۔ شاہ صاحب کا ترجمہ بھی متعدد مترجموں نے اختیار کیا ہے جبکہ متعدد دوسروں نے دین کا ترجمہ قیامت کا دن بھی کیا ہے۔ سرسید نے: حاکم ہے انصاف کے دن کا" اور ڈپٹی نذیر احمد نے "روز جزا کا حاکم" ترجمہ کیا ہے جبکہ معاصر علماء میں مولانا تھانوی نے "مالک ہیں روز جزا کے" مولانا مودودی نے "روز جزا کا مالک ہے" اور مولانا اصلاحی نے جزا کے ساتھ سزا کا اضافہ کیا ہے۔ مولانا آزاد نے ترجمہ سے زیادہ تشریح یوں کی ہے: "جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلا لوگوں کے حصے میں آئے گا"

تفسیر و تشریح کے ضمن میں بیشتر مفسرین نے قیامت کے دن اچھے برے تمام کاموں کا بدلا دیئے جانے کی بات کہی ہے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ "الدین کا لفظ جزا کے قانون کا اعتراف ہے اور۔۔۔ یہ حقیقت واضح کردی ہے کہ جزا انسانی اعمال کے قدرتی نتائج و خواص ہیں" مولانا مودودی نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ "۔۔۔ رحمٰن اور رحیم کے کہنے کے بعد مالک روز جزا کہنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ نرا مہربان ہی نہیں بلکہ منصف بھی ہے۔۔۔ لہٰذا ہم اس کی ربوبیت اور رحمت کی بنا پر اس سے محبت ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے انصاف کی بنا پر اس سے ڈرتے بھی ہیں اور یہ احساس بھی رکھتے ہیں کہ ہمارے انجام کی بھلائی اور برائی بالکلیہ اسی کے اختیار میں ہے" مولانا اصلاحی نے خدا کے اقتدار اعلیٰ اور اس کے بلا روک ٹوک نفاذ پر زور دیا ہے۔ سید احمد شہیدؒ کی تشریح اس پس منظر میں کافی دلچسپ نظر آتی ہے وہ فرماتے ہیں:

"جزا کا دن قیامت ہے اور اللہ کی مالکیت ہمیشہ ہے: دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ مگر ان دونوں میں اتنا فرق ہے کہ دنیا میں بظاہر اور بھی مالک کہلاتے ہیں گو وہ مالکیت عاریت اور ناپائیدار ہے، کیونکہ اصل مالک اللہ ہی ہے لیکن قیامت میں یہ عاریت کی ملکیت بھی اٹھ جاوے گی"

سید شہیدؒ نے اس کے بعد رعیتی اور زمیندار، راجہ، نواب اور بادشاہ کے اقتدار ناپائیدار کی مثالوں سے وضاحت کی ہے اور قیامت میں صرف اقتدار الٰہی مطلقہ نافذہ کا ذکر کیا ہے۔

ایاک نعبد کا ترجمہ بیشتر مترجمین نے: "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں" کیا ہے بعض مترجمین

کے یہاں جملہ کی ساخت میں فرق ہے مگر تعبیر یہی ہے۔ ان میں مولانا تھانوی، مولانا مودودی، سر سید ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ شامل ہیں۔ مولانا آزاد اور مولانا اصلاحی ان علماء میں سے ہیں جنھوں نے عبادت کی جگہ بندگی استعمال کیا ہے۔ سید احمد شہیدؒ نے اس کا ترجمہ: "تجھی کو پوجتے ہیں ہم" کیا ہے جبکہ رسالہ نماز میں انھوں نے شاہ عبدالقادر کا ترجمہ: "تجھی کو ہم بندگی کریں" تھوڑے سے فرق کے ساتھ قبول کیا ہے۔ اٹھارہویں۔ بیسویں صدی کے بعد مترجموں نے غالباً سید شہیدؒ کی پیروی میں لفظ "پوجنا" استعمال کیا ہے۔ بیشتر مفسّرین نے اس کی تفسیر میں توحید الٰہی کے اقرار و عمل اور شرک سے گریز و اجتناب کے انسانی اعتراف کو بیان کیا ہے۔ مولانا مودودی نے اس کے تین مفہوم بیان کئے ہیں۔ جو پوجا اور پرستش، اطاعت و فرمانبرداری اور بندگی و غلامی ہیں اور اس آیت کریمہ میں تینوں بیک وقت مراد ہیں۔ مولانا اصلاحی نے انتہائی خضوع، انتہائی عاجزی و فروتنی کے ساتھ اطاعت غیر مشروط کو بھی شامل بتایا ہے۔ سید احمد شہیدؒ نے سب سے انوکھی تعبیر کی ہے وہ لکھتے ہیں:

> "یعنی عبادت نری اللہ کی ہے۔ عبادت اصل میں تعظیم کا نام ہے۔ تعظیم کی دو طرح ہیں: ایک وہ کہ خالص اللہ نے خاص اپنے واسطے مقرر کی جیسے نماز، روزہ حج۔ نماز کسی کے لیے نہ پڑھے روزہ کسی کے واسطے نہ رکھے سوا خدا کے۔ اور جو کوئی سوا خدا کے اور کے واسطے کچھ بھی کرے شرک ہوتا ہے۔ اور اس کے سوا تعظیم کرنی اس کو بھی اللہ واسطے ایک طرح خاص جانے کہ اللہ کے حکم سے کرتا ہوں، ماں باپ کی تعظیم اور خدمت سب اللہ کے حکم سے بجالاوے کہ اللہ کی مرضی ہے اس واسطے کرتا ہوں۔ اس وجہ سے ساری تعظیم کی صورتیں اللہ کی ہو جاتی ہیں خاص کر۔"

سید شہید کی اس تشریح سے وہ تمام اطاعتیں، تعظیمیں اور فرمانبرداریاں جو دنیا میں انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں یا مخلوقات کی کرتا ہے وہ بھی تعظیم الٰہی کے مصداق بن جاتی ہیں کہ وہ حکم و مرضی ربانی سے کی جاتی ہیں بشرطیکہ نیت و ارادہ صحیح ہو۔ یہ تشریح اب تک کسی دوسرے مفسّر کے یہاں نہیں مل سکی۔

آیت بالا کے دوسرے جز: وایاك نستعین کا ترجمہ زیادہ تر مفسرین نے استعانت، مدد چاہنے، مانگنے سے کیا مذکورہ بالا تمام مفسرین و مترجمین ان میں شامل ہیں۔ البتہ مولانا تھانوی نے اس کا ترجمہ: "اور آپ ہی سے درخواست عنایت کی کرتے ہیں" سید احمد شہیدؒ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: "اور تجھی سے اعانت چاہتے ہیں ہم" انھوں نے رسالہ نماز میں شاہ عبدالقادر کا ترجمہ: "اور تجھی سے ہم مدد چاہتے ہیں" تھوڑے سے تصرف کے ساتھ اختیار کیا ہے۔

تفسیر میں تقریباً تمام علماء و مفسرین نے عبادت و معاملات غرضکہ ہر کاوش انسانی میں اعانت الٰہی چاہی ہے۔ سید احمد شہیدؒ نے اسی تفسیر کو اپنے دل نشیں انداز میں یوں پیش کیا ہے:

> "اعانت کا بھی حال عبادت کا سا ہے۔ ایک اعانت وہ ہے کہ اللہ کے ساتھ خاص ہے جیسے رزق، اولاد، بزرگی مانگنی۔ کسی سے یہ چیزیں مانگنی درست نہیں ہے، اور کسی کے اختیار میں یہ چیزیں نہیں۔ اور ایک اعانت ایسی ہے کہ ظاہر ایک آدمی دوسرے سے چاہتا ہے جیسے پانی مانگنا، کھانا پکوانا، اس کو بھی اللہ کے حکم سے جانے تو یہ بھی استعانت اللہ سے ہے کہ اللہ کی مرضی کے مطابق ہم اعانت چاہتے ہیں وہ بھی اللہ کی اعانت ہے۔۔۔"

سید احمد شہیدؒ نے اس کے بعد امیر و خدمت گاروں اور بادشاہ اور اسکے غلاموں کی مثال دی ہے کہ ان کی اعانت دراصل امیر و بادشاہ کی اعانت ہے۔ اگر بندہ اپنے مالک کے در سے نہ ٹلے اور اسی کی تعریف کرتا رہے تو مالک اپنے بندے پر فضل بے پایاں کرتا ہے اور اس کے سوال کو کبھی رد نہیں کرتا۔ اور خدائے ذوالجلال اپنے کرم بیکراں سے بندہ کو یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اس سے کیا مانگے اور وہ دعا یہ بتلائی۔

اھدنا الصراط المستقیم جس کا ترجمہ سید صاحبؒ نے کیا ہے: "بتلا ہم کو راہ سیدھی"۔ جبکہ حقیقت الصلوٰۃ میں انھوں نے شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ترجمہ: "چلا ہم کو راہ سیدھی" اختیار کیا ہے۔ قدیم مفسرین و مترجمین کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: اوّل وہ جس نے شاہ صاحب موصوف کا ترجمہ اختیار کیا ہے۔ دوسرے طبقہ نے اھدنا کا ترجمہ "دکھا" کیا ہے اور تیسرے طبقہ نے "بتا" یا "بتلا" کیا ہے۔ جدید و معاصر مفسرین میں مولانا تھانوی اور مولانا مودودی نے "دکھا"

ترجمہ کیا ہے جبکہ مولانا آزاد پورے فقرہ کا ترجمہ: (خدایا) ہم پر (سعادت کی) سیدھی راہ کھول دے، کیا ہے اور مولانا اصلاحی نے "ہمیں سیدھے رستے کی ہدایت بخش" کیا ہے۔ صراط مستقیم کا زیادہ تر ترجمہ سیدھی راہ، سیدھا راستہ/راستہ کیا ہے۔ بعض ترجموں میں "راہ راست" اور "راہ مضبوط" بھی ملا ہے۔ بیشتر مفسرین نے صراط مستقیم کی جو تشریح کی ہے وہ یہ ہے کہ "زندگی کے ہر شعبہ میں خیال اور عمل اور برتاؤ کا وہ طریقہ ہمیں بتا جو بالکل صحیح ہو..... جس پر چل کر ہم سچی فلاح وسعادت حاصل کر سکیں" الفاظ وجملوں کا فرق ہے مگر مفہوم سب کا یہی ہے۔ سید احمد شہیدؒ نے ان سب سے ہٹ کر یہ تشریح کی ہے:

"صراط مستقیم سے اللہ کی رضا سمجھنا چاہیئے، اور چیز اس مقام پر سمجھنی لائق نہیں، اس واسطے کہ جو کوئی کچھ مانگے کتا ہی خوب سے خوب مانگے اللہ کے خزانوں میں ہزار چند اس سے بہتر ہو سکتا ہے.... اس واسطے اچھا سوال یہی ہے کہ اس کی رضا مانگے اپنی تجویز نہ کیجیے۔ اس کی رضا سے جو ہوگا سو خوب ہوگا۔ اور اپنی تجویز بہت بہتر سے بہتر بھی کبھی پشیمانی اور پچھتاوا ہو جاتا ہے... اس لیے اصل مانگنا اس کی رضا کا ہے۔ جب اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اپنے بندے سے راضی ہو جو چاہے اور جو گمان خیال سے باہر ہو وہ بخشتا ہے اور دیتا ہے اور اس کی ذات کا تقاضا بھی ہے اور رضا اس کی بے پایاں ہے... اور رضا خدا کی ہر اچھے کام پر ہوتی ہے۔ اور اچھا کام کبھی بروں سے بھی ہو جاتا ہے جیسے عدالت انصاف کسی بات میں کبھی کوئی کافر بھی کرتا ہے اور بعضے کافر محتاجوں کو دیتے ہیں... ایسی باتوں سے اور کاموں سے اللہ راضی ہوتا ہے پر یہ رضا کچھ کام نہ آوے گی۔ دنیا میں اللہ چاہے بدلا دے پر آخرت میں ان کو کچھ فائدہ نہیں ہے۔ جب اللہ کی رضا بعضے اچھے کام کہ بروں سے ہوتی ہے ان پر بھی ہو دے تو اس واسطے صراط المستقیم کا بیان بتلایا کہ صراط الذین انعمت علیہم۔ راہ ان کی جن پر فضل کیا تو نے"

سید صاحبؒ نے حقیقت الصلوٰۃ میں شاہ عبدالقادر کا ترجمہ: "ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل کیا" تھوڑے سے تصرف یعنی لفظ "لوگوں" کو ساتھ کر کے قبول کیا ہے۔ ابتدائی مترجموں

نے فضل، فضل وکرم، نعمت، انعام، انعام کا فضل ترجمہ کیا ہے۔ سرسید نے "بخشش کی" ترجمہ کیا جبکہ معاصرین میں مولانا تھانویؒ، مولانا مودودی اور مولانا آزاد نے "انعام فرمایا/کیا" ترجمہ کیا ہے۔ اور مولانا اصلاحی نے فضل کا لفظ اختیار کیا ہے۔ بیشتر مترجمین نے "فضل" کو "انعام" کے مترادف یا ترجمان مانا ہے۔ اس فقرہ کی تشریح مختصر طور سے سید صاحب نے اس طرح کی ہے:

"وہ لوگ پیغمبر اور صدیق اور شہید ہیں صالح ہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ اپنی وہ رضا ہمیں دے جو ایسے لوگوں کو دی۔ نہ ویسی رضا کہ جیسے کسی اچھے کام پر بعضے برے لوگوں کو ہو جاتی ہے کہ ان پر غصے بھی ہوتا ہے۔ ان کی برائیوں سے اسی واسطے فرمایا:

غیر المغضوب علیہم نہ وے کہ جن پر غصہ کیا... ولا الضالین اور نہ گمراہ..."

رسالہ حقیقت الصلوٰۃ میں انھوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے: "نہ ان کی جن پر غصہ ہوا ہے اور نہ بہکنے والوں کی" یہ ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ: "نہ وہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بہکنے والے" سے قدرے مختلف ہے۔ ابتدائی اور معاصر مفسرین نے عام طور سے ان دونوں فقروں کا ترجمہ غصہ کئے گئے/غضب کیے گئے اور گمراہ، بہکنے والے ہی کیا ہے۔ بعض لوگوں نے ضالین کا ترجمہ بھٹکے ہوئے کیا ہے۔ مولانا تھانوی نے یہ ترجمہ کیا ہے: "نہ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو رستہ سے گم ہو گئے" مولانا آزاد کا ترجمہ ہے: "ان کی نہیں جو پھٹکارے گئے اور نہ ان کی جو راہ سے بھٹک گئے" مولانا مودودی نے "جو معتوب نہیں ہوئے ہیں" ترجمہ کیا ہے جبکہ مولانا اصلاحی نے "جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ" ترجمہ کیا ہے۔

سید صاحب اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:

"جیسے گنہگار فاسق کہ خدا کے غضب میں ہیں ہر چند کوئی کام ان سے اچھا بھی ہو جاوے کہ اللہ کی یہاں مرضی ہو... یعنی کافر ہر چند ان سے بھی کبھی کوئی کام اللہ کی رضامندی کا ہو جاوے پر ان کی راہ بھی ہرگز نہیں مانگنا ان کے نصیب میں رضامندی نہیں کہ جو آخرت میں فائدہ دے"

سید احمد شہید کے اس ترجمہ و تشریح میں دو اہم نکتے ہیں اوّل یہ کہ وہ شاہ عبدالقادر دہلوی

سے متأثر ہیں اور دوم یہ کہ انھوں نے دونوں ناپسندیدہ طبقات کو عام رکھا ہے جبکہ پسندیدہ اور ہدایت یافتہ طبقات کی نشاندہی کی ہے۔ مولانا تھانوی، مولانا آزاد اور مولانا مودودی کی تشریحات میں سیّد احمد شہید کے افکار و زبان کی گونج واضح طور سے سنائی دیتی ہے جبکہ دوسرے علماء کے یہاں اس کا اتنا اثر نظر نہیں آتا۔ عام طور سے مفسرین نے غیر المغضوب علیہم سے مراد یہود کو لیا ہے اور الضالین سے نصاریٰ کو۔ مولانا اصلاحی نے ان دونوں کو ان بدبخت طبقات کی واضح مثال قرار دیا ہے۔ مولانا تھانوی، مولانا آزاد، مولانا مودودی وغیرہ متعدد علماء نے ان کو عام طبقات رکھا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

حضرت سیّد احمد شہیدؒ کی تفسیر سورۂ فاتحہ اردو میں سب سے پہلی کاوش نہ سہی مگر وہ اولین مطبوعہ تحریر ضرور ہے۔ حضرت کے استاذ گرامی شاہ عبدالقادر صاحب دہلویؒ اور ان کے برادر مفسر شاہ رفیع الدّین دہلوی کی تفسیر اتنی ایجاز پسند ہے کہ اس کو تفسیر کہنا مشکل ہے۔ رسالہ حقیقت الصّلوٰۃ اور تفسیر سورہ فاتحہ کے موازنہ سے سیّد احمد شہیدؒ کے فکری ارتقا کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ابتداً، وہ اپنے استاذ محترم سے نہ صرف متأثر نظر آتے ہیں بلکہ ان کے ہر نقش قدم کی پیروی کرتے ہیں مگر بعد میں وہ اپنے فکر و تدبّر کی روشنی میں ترجمہ و تفسیر کرتے ہیں اور بہتر طور سے کرتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی ذہن نشین رکھنی ضروری ہے کہ سیّد احمد شہیدؒ نے اصلاً یہ تقریر فرمائی تھی اور خود قلمبند نہیں کیا تھا، بلکہ مولانا عبدالحی صاحب سے تحریر کروائی تھی۔ اپنے قلم سے تحریر کرنے میں زبان و اسلوب کا جو فرق عظیم پڑتا ہے وہ اہل قلم و صاحبان علم سے پوشیدہ نہیں۔ زبان و طرز ادا کے لحاظ سے سید شہید کی زبان میں بعض ناہمواریاں آج ضرور نظر آتی ہیں۔ جملوں کی ساخت میں کہیں کہیں الجھاؤ ہے، اضافت کا موجودہ اصول معدوم ہے۔ صفت موصوف میں تقدیم و تاخیر نظر آتی ہے۔ حرف عطف "اور" کا کثرت سے استعمال ہوا ہے اور جملوں کے آغاز میں ہوا ہے جو بری طرح کھٹکتا ہے، بعض متروک الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ بایں ہمہ ان کی زبان اپنی سلاست، روانی اور دل نشینی کے لحاظ سے ادبی کسوٹی پر کھری اترتی ہے۔ زبان کی تمام ناہمواریاں آج کے ترقی یافتہ ادب کے اعتبار سے نظر آتی ہیں ورنہ وہ اپنے عہد کی بہت عمدہ ادبی اسلوب کی ترجمان ہے اور وہ خواجہ احمد فاروقی کے اس دعوے

کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اُردو میں سلیس، سادہ، تکلفات سے معرا اور دلکش زبان کی داغ بیل نہ سرسیدؒ نے ڈالی تھی اور نہ فورٹ ولیم کالج کے انگریز مہذب اُردو نثر نگاروں نے بلکہ اس کی ابتداء وہابی مصنفین کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اس پر یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت سیّد احمد شہید نے فکری قیادت کے ساتھ ساتھ زبان و اسلوب ایجاد کرنے میں بھی سرخیلی کی تھی۔ فکر و تفسیر کے لحاظ سے بھی شہیدؒ کی تفسیر ایک ممتاز و منفرد مقام کی حامل ہے اور اسلوب و زبان کے اعتبار سے۔ اس نے اپنے معاصروں اور اخلاف پر دونوں اعتباروں سے اثر ڈالا تھا جس کی شہادت شاہ اسمٰعیلؒ کی تقویۃ الایمان اور مولانا تھانوی، مولانا آزاد و مولانا مودودی وغیرہ کی تفسیریں دیتی ہیں۔

بقیہ ۸۲ سے آگے:۔

سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک کا اثر پشتو ادب پر

(سیّد احمدؒ بادشاہ شونگرہ پایاں روانہ ہو گئے کہ ان پر کفار بہت غالب آ گئے اور حوروں نے ان کو پیالے لا کر دیئے اور جنّت کے دروازے ان کے لیے کھل گئے۔ اے مولوی! اللہ تعالیٰ آپ سب کو جنّتی بنا دے۔)

ایک شاعر موسیٰزی نے ایک زوردار چار بیتہ لکھا جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

قاصد د بادشاہ راغے یوسف زے اولرزیدو

بہ نیت دُعزالا روپہ نو مبارا در ژیدو

(بادشاہ (سیّد صاحبؒ) کا قاصد آ گیا تو تمام یوسف زئی مشتعل ہو گئے اور عزا کی نیت سے نوشہرہ جا کر میدان میں پھیل گئے)

پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویۃ الایمان" کا فکری و ادبی اسلوب

اردو ادب کے مؤرخین کا عام خیال ہے کہ صاف، سادہ اور تکلّفات سے معرّیٰ نثر لکھنے کا رواج سرسیّد اور ان کے رفقاء کی تحریروں سے ہوا۔ بعض مؤرخین کا یہ بھی خیال ہے کہ اس کی بناء فورٹ ولیم کالج اور دلّی کالج کے مصنفوں نے ڈالی تھی۔ لیکن خواجہ احمد فاروقی نے اپنے مضمون "اردو میں وہابی ادب" (نئی دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۳۸) میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ سلیس اردو نثر لکھنے کا آغاز وہابی مصنفین نے کیا تھا، جن کے سرخیل سید احمد شہید تھے۔ خواجہ صاحب موصوف نے بعض اقتباسات کو پیش ضرور کیا ہے، لیکن انھوں نے اپنے دعوے کو پوری طرح مدلّل نہیں کیا ہے۔ اس مختصر مقالہ میں سید احمد شہید اور ان کی تحریک کی ایک نمائندہ کتاب یعنی شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویۃ الایمان" کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

"تقویۃ الایمان" شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی ایک نامکمل کتاب ہے جو ایک باب اور پانچ فصلوں پر مشتمل ہے۔ شاہ صاحب کے جمع کئے باقیماندہ مواد کو ان کے ایک مرید و شاگرد محمد سلطان صاحب نے تذکیر الاخوان بقیہ تقویۃ الایمان کے نام سے ۱۲۵۰ھ میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔ خواجہ احمد فاروقی کا خیال ہے کہ:

> "تقویۃ الایمان کا پہلا حصہ ایسی سلیس، صاف اور مربوط اردو میں لکھا گیا ہے کہ اردو کی چند کتابیں ہی اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔"
>
> (اردو میں وہابی ادب، ص ۴۱)

وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

"تقویۃ الایمان بیسیوں مرتبہ شائع ہوئی ہے، اور یہ شرف اردو کی کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہوا۔"

(اردو میں وہابی ادب، ص ۳۷ - ۳۸)

مگر پھر دوسری جگہ سید احمد شہید کی تحریک کے زیر اثر پروان چڑھنے والے ادب کو ادبی اعتبار سے زیادہ وقیع قرار نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ:

"اس میں وہ فنی خوبیاں بھی نہیں جو اسے حلقۂ شام و سحر سے نکال کر جاوداں بنا دیں۔ لیکن ہمیں اس کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کرنا چاہئے کہ .... اس زمانہ میں جب اردو نثر تکلفات سے گرانبار تھی، اس نے صفائی، سادگی اور صراحت کی ایک نئی بنیاد قائم کی۔ اور دراصل یہی اس کی غایت اور اہمیت ہے۔"

(اردو میں وہابی ادب، ص ۵۱)

تقویۃ الایمان کے مطالعہ سے جو پہلی ادبی خصوصیت سامنے آتی ہے وہ فکر کی صراحت اور زبان کی سلاست ہے۔ توحید و شرک جیسی پیچیدہ بحثوں کو اتنی آسان زبان میں بیان کیا گیا ہے کہ عام آدمی اس کو بلا کسی تکلف و تردد کے سمجھ لے۔ اسلامی فکر کے بنیادی مآخذ اور انسان کے عقلی خیالات کا موازنہ کرتے ہوئے شاہ صاحب اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:

"ہر آدمی کو چاہئے کہ ایمان کے درست کرنے میں بڑی کوشش کرے، اور اس کے حاصل کرنے کو سب چیزوں سے مقدم رکھے۔ اور اس زمانہ میں دین کی بات میں لوگ کتنی راہیں چلتے ہیں، کتنے پہلوں کی رسموں کو پکڑتے ہیں، کتنے قصے بزرگوں کے دیکھتے ہیں، اور کتنے مولویوں کی باتوں کو جو انھوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے نکالی ہیں سند پکڑتے ہیں، اور کتنے اپنی عقل کو دخل دیتے ہیں۔ اور ان سب سے بہتر راہ یہ ہے کہ اللہ و رسولؐ کے کلام کو اصل

رکھئے، اور اس کی سند پکڑئیے، اور اپنی عقل کو کچھ دخل نہ دیجئے، اور جو قصہ بزرگوں کا یا کلام مولویوں کا اس کے موافق ہو قبول کیجئے، اور جو موافق نہ ہو اس کی سند نہ پکڑئیے، اور جو رسم اس کے موافق نہ ہو اس کو چھوڑ دیجئے۔"

(تقویۃ الایمان ص ۱-۲)

شاہ صاحب نے اس کے بعد اس عوامی غلط فہمی کو کہ "اللہ و رسولؐ کا کلام سمجھنا بہت مشکل ہے" کی بہت تفصیل و صراحت کے ساتھ تردید کرتے ہوئے بہت خوبصورت انداز میں ثابت کیا ہے کہ ہدایت کے لئے قرآن و حدیث کو سمجھنا بہت آسان ہے۔

(تقویۃ الایمان ص ۲-۳)

کتاب کے اصل موضوع کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"ایمان کے دو جزو ہیں:

خدا کو خدا جاننا۔

اور رسولؐ کو رسول سمجھنا۔

خدا کو خدا سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کا شریک کسی کو نہ سمجھے۔

اور رسولؐ کو رسول سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے سوا کسی کی راہ نہ پکڑے۔

پہلی بات کو توحید کہتے ہیں، اور اس کے خلاف کو شرک۔

اور دوسری بات کو اتباع سنت کہتے ہیں اور اس کے خلاف کو بدعت۔"

(تقویۃ الایمان، ص ۳)

اس اقتباس سے توحید و شرک اور سنت و بدعت کا فرق آسان پیرایہ میں بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحب نے پہلا باب "توحید و شرک کے بیان میں" قائم کیا ہے اور اس کی پانچ ذیلی فصلیں بنائی ہیں، جن کے عناوین عربی ہی میں قائم رہنے دیئے گئے ہیں، اور ان کے اردو ترجمہ میں بھی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ یہ فصلیں اس طرح ہیں:

الفصل الاول فی الاجتناب عن الاشراک (پہلی فصل بچنے میں شرک سے) ص ۱۳-۲۲

الفصل الثانی فی رد الاشراک فی العلم (فصل دوسری بیان میں برائی شرک فی العلم کی) ص ۲۲-۳۱

الفصل الثالث فی ذکر رد الاشراک فی التصرف (فصل تیسری اشراک فی التصرف کی برائی کے بیان میں) ص ۳۱-۴۴

الفصل الرابع فی ذکر رد الاشراک فی العبادۃ (چوتھی فصل اشراک فی العبادت کی برائی کے بیان میں) ص ۴۴-۵۵

الفصل الخامس فی رد الاشراک فی العادات (فصل پانچویں اشراک فی العادات کی برائی کے بیان میں) ص ۵۶-۸۲

پہلے باب میں توحید و شرک کو جس صراحت و سادگی سے بیان کرتے ہیں قابل دید ہے، کہتے ہیں:

"اول معنی شرک و توحید کے سمجھنا چاہیئے تاکہ برائی بھلائی ان کی قرآن و حدیث سے معلوم ہو جائے۔ اکثر لوگ پیروں کو، پیغمبروں کو، اور اماموں کو اور شہیدوں کو، اور فرشتوں کو، اور پریوں کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں۔۔۔۔ غرضکہ جو کچھ ہندو اپنے بتوں سے کرتے ہیں، وہ سب کچھ یہ جھوٹے مسلمان انبیاء اور اولیاء اور اماموں اور شہیدوں سے اور فرشتوں سے اور پریوں سے کر گذرتے ہیں۔۔۔۔ ان سب باتوں کا سبب یہ ہے کہ خدا و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو چھوڑ کر اپنی عقل کو دخل دیا، اور جھوٹی کہانیوں کے پیچھے پڑے، اور غلط سلط رسموں کی سند پکڑی۔"

(ص ۴-۵)

توحید الٰہی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اب یہ بات تحقیق کی چاہیئے کہ اللہ صاحب نے کون کون سی چیزیں اپنے واسطے خاص کر رکھی ہیں کہ اس میں کسی کو شریک نہ کیا جائے، سو وہ باتیں بہت ساری ہیں، مگر کئی باتوں کا ذکر کر دینا اور ان کو قرآن و حدیث سے ثابت کر دینا ضروری ہے، تاکہ اور باقی باتیں ان سے لوگ سمجھ لیں۔ سو اول بات یہ کہ ہر جگہ حاضر و ناظر رہنا، اور ہر چیز کی خبر ہر وقت برابر

دکھنی دور ہو یا نزدیک، کھلی ہو یا چھپی، اندھیرے میں ہو یا اُجالے میں، آسمان میں ہو یا زمینوں میں، پہاڑوں کی چوٹی پر ہو یا سمندر کی تہ میں۔ یہ اللہ ہی کی شان ہے، اور کسی کی یہ شان نہیں۔" (ص ۹)

فصل اول میں مجمل شرک کی بُرائی کا ذکر کرتے ہوئے سورۂ نساء کی آیت ۴۸ "ان اللہ لایغفران یشرک بہ، ویغفر مادون ذلک لمن یشاء الخ" کی وضاحت کرتے ہیں اور اس کی تائید میں اپنے طریقہ کے مطابق متعدد آیات قرآنی اور احادیث نبوی پیش فرماتے ہوئے خوبصورت، سادہ اور دلنشیں انداز میں ان کی تشریح کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

"اللہ کی راہ بھولنا یوں بھی ہوتا ہے کہ حرام و حلال میں امتیاز نہ کرے، چوری، بدکاری میں گرفتار ہو جائے، نماز روزہ چھوڑ دے، جورو بچوں کا حق تلف کرے، ماں باپ کی بے ادبی کرے، لیکن جو شرک میں پڑا وہ سب سے زیادہ بھولا، اس لئے کہ وہ ایسے گناہ میں گرفتار ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہرگز نہ بخشے گا، اور سارے گناہوں کو اللہ شاید بخش بھی دے۔" (ص ۱۴)

دوسری فصل میں سورۂ انعام کی آیت ۵۹ "وعندہ مفاتح الغیب لایعلمھا الاھو کی تشریح میں فرماتے ہیں:

"جس طرح اللہ صاحب نے بندوں کے واسطے ظاہر کی چیزیں دریافت کرنے کو کچھ راہیں بنا دی ہیں، جیسے آنکھ دیکھنے کو، کان سننے کو، ناک سونگھنے کو، زبان چکھنے کو، ہاتھ ٹٹولنے کو، عقل سمجھنے کو، اور وہ راہیں ان کے اختیار میں دی ہیں۔۔۔۔ اسی طرح غیب کا دریافت کرنا اپنے اختیار میں ہو جب چاہے کر لیجئے، یہ اللہ صاحب ہی کی شان ہے۔ کسی ولی و نبی کو، جن و فرشتہ کو، پیر و شہید کو، امام و امام زادہ کو، بھوت و پری کو اللہ صاحب نے یہ طاقت نہیں بخشی کہ جب وہ چاہیں غیب کی بات معلوم کر لیں، بلکہ اللہ صاحب اپنے ارادہ سے کبھی کسی کو جتنی بات چاہتا ہے خبر دیتا ہے۔ یہ بھی اپنے ارادہ کے

موافق، نہ ان کی خواہش پر۔" (ص ۲۳)

اس اقتباس میں شاہ صاحب نے غیب سے متعلق قرآن و حدیث کا نچوڑ بہت صاف اور سلیس انداز میں پیش کر دیا ہے۔

تیسری فصل میں بحث کا آغاز سورۂ مومنون کی آیت ۸۸ "قل من بیدہ ملکوت کل شیئ وھو یجیر ولا یجار علیہ الخ" سے کیا ہے، اور اسکی خوبصورت تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جس سے پوچھئے کہ ایسی شان کس کی ہے کہ ہر چیز اس کے قابو میں ہے، جو چاہے سو کر ڈالے، اس کا ہاتھ کوئی پکڑ نہ سکے، اور اس کی حمایت میں کوئی ہاتھ ڈال نہ سکے، اور اس کے تقصیروار کو کہیں پناہ نہ مل سکے اور اس کے مقابلہ میں کسی کی حمایت چل نہ سکے۔ سو ہر کوئی یہی جواب دے گا کہ ایسی شان اللہ کی ہے۔" (ص ۳۱-۳۲)

اسی صاف اور سلیس انداز میں اس موضوع سے متعلق متعدد دیگر قرآنی آیات و احادیث نبوی کی مبسوط تشریح کی ہے۔

چوتھی فصل میں سورۂ ہود کی آیت ۲۵-۲۶ ... ان لا تعبدوا الا اللہ الخ سے عبادت میں شرک کی تردید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسلمان اور کافروں میں مقابلہ حضرت نوح ہی کے وقت سے شروع ہوا ہے، جب ہی سے اس بات پر مقابلہ ہے کہ اللہ کے مقبول بندے یہی کہتے آئے ہیں کہ اللہ کی سی تعظیم کسی اور کی نہ چاہیئے، اور جو کام اس کی تعظیم کے ہیں وہ اوروں کے واسطے نہ کیجیئے۔" (ص ۴۴)

شاہ صاحب پر سید احمد شہید صاحب کی فکر و تعبیر اور زبان و بیان کا جو اثر تھا وہ اس اقتباس میں پوری طرح جھلک رہا ہے۔

پانچویں فصل میں سورۂ نساء کی آیات ۱۱۷-۱۲۱ إن یدعون من دونہ إلا إناثا الخ کے ترجمہ کے بعد تشریح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ:

"آدمی اپنے دنیا کے کاموں میں جیسا معاملہ اللہ سے رکھتا ہے کہ اس کی تعظیم طرح طرح سے کرتا ہے، ویسا ہی معاملہ اور کسی سے نہ کرے۔"

(ص ۵۶)

مذکورہ بالا آیات اور اصول کی تشریح و توضیح میں متعدد آیات قرآنی ـــ اور احادیث نبویؐ سے اپنے طریقہ کے مطابق استدلال کیا ہے اور سادہ و سلیس نثر میں اپنی بات کی وضاحت کی ہے۔

شاہ صاحب کی تحریروں میں سید احمد شہید صاحب کی فکر و اسلوب کی نمایاں طور پر عکاسی ملتی ہے۔ اس مختصر سے مقالہ میں ان کی فکر سے اگرچہ اتنی بحث نہیں ہے۔ تاہم یہ کہے بغیر چارہ بھی نہیں کہ شرک کی مختلف قسموں پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب نے جس فکری صلابت، بیان کی صراحت و سلاست اور قلم کی شرافت کا ثبوت دیا ہے وہ کج بحثی اور بحث برائے بحث سے دور، اور قارئین تک اپنی بات دلنشیں انداز میں پہنچانے کی بہترین مثال ہے۔ شاہ صاحب نے فکری لحاظ سے کسی مخصوص طبقہ پر نکتہ چینی یا مخالفین پر طعنہ زنی کا رویہ اختیار نہیں کیا ہے، اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا ہے کہ داعی و مدعو کے درمیان کوئی ایسی دیوار نہ کھڑی کی جائے جو دعوت کے بھاؤ کو روک دے۔

عموماً فکر کو زبان کا صحیح پیکر نہیں ملتا، اس لئے بڑے مفکرین کی بات بھی دل تک نہیں پہنچتی، شاہ صاحب نے جو زبان اور اسلوب اختیار کیا وہ دماغ سے ہو دل تک پہنچتا ہے اور اثر کرتا ہے۔ ان کی زبان میں قدامت کی بعض جھلکیاں ضرور ہیں، جملوں کی ساخت میں فرق ہے، صفت موصوف میں تقدیم و تاخیر پائی جاتی ہے، بعض الفاظ عطف نہیں ملتے، کہیں کہیں مصدر کی جگہ فعل استعمال کیا گیا ہے، تاہم زبان کی ان تمام ناہمواریوں کے باوجود آج کے معیار سے بھی ان کی زبان خوبصورت، دلنشیں، بامحاورہ اور ایجاز پسند ہے جو آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی زبان کا بہترین نمونہ ہے۔

اس کے "حلقۂ شام و سحر" سے نکل کر جاوداں ہونے کے لئے یہی علامت

(باقی ص ۱۳۹ پر)

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری
جامعہ سلفیہ۔ بنارس

الدّر المنثور معروف بہ تذکرۂ صادقہ
کا
اجمالی تعارف

الحمد للہ وکفیٰ، وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، أما بعد!

مقام مسرت ہے کہ رابطہ ادب اسلامی کے اجتماع منعقدہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بتاریخ ۱۱، ۱۲ نومبر ۱۹۸۷ء کے لئے "تحریک سید احمد شہیدؒ کا اردو زبان وادب پر اثر" کا عنوان منظور کیا گیا ہے۔

اس تحریک کے اردو زبان وادب پر اثرات سے متعلق ابھی بہت مختصر کام ہوا ہے، جس سے ان اثرات کا پورا تعارف سامنے نہیں آپاتا، تحریک سے وابستہ بہت سے افراد کی مختلف وقیع تحریریں یا تو اب تک طبع نہیں ہوسکی ہیں، یا اگر پہلے کبھی طبع ہوئی تھیں تو اس وقت لوگوں کے سامنے نہیں ہیں۔

چوں کہ یہ تحریک ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیلی، زندگی کے تقریباً ہر پہلو کو اس نے متاثر کیا، فکر وعمل کی دنیا میں اس سے محسوس تبدیلی ہوئی اور اس کی خدمت کے لئے علماء وعوام ہر ایک نے اپنی اپنی بساط کے مطابق کوشش کی اس لئے مناسب تھا کہ زبان وادب سے متعلق بھی اس تحریک کے اثرات کا جائزہ لیا جائے۔

اس تحریک سے وابستہ اہل قلم نے مختلف دینی وتاریخی موضوعات پر مفید تحریریں چھوڑی ہیں جن سے ان کے علمی وادبی ذوق اور تصنیف وتالیف کے مشغلہ سے دلچسپی کا

پتہ چلتا ہے۔

تحریک کی دعوت کو عام کرنے میں خاندان صادقپور کا حصہ بیحد نمایاں ہے۔ اس خاندان کے باکمال و باہمت افراد نے مختلف حیثیتوں سے اس تحریک کو سینچا اور اس کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا، اس خانوادۂ علم و عمل کے افراد کی زندگی کیسی گذری، ان کی تحریک کے لئے کیا قربانیاں تھیں اور انھوں نے کس طرح تحریک سے اپنی وابستگی برقرار رکھی؟ ان سب سوالات کے جواب کے لئے اسی خاندان کے ایک فرد نے ایک "تذکرۂ صادقہ" مرتب کیا تھا، آئندہ سطور میں اسی تذکرہ کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے:

تذکرۂ صادقہ کے مشتملات

مولانا ابوالفتح محمد عبدالرحیم زبیری ہاشمی صادقپوری متوفی ۱۳۴۱ھ کی کتاب "الدر المنثور فی تراجم اہل صادق پور معروف بہ تذکرۂ صادقہ" ایک مقدمہ، پانچ فصلوں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

مصنفؒ کی تصریح کے مطابق مقدمہ سببِ تالیف اور مولانا ولایت علیؒ کی ہاشمیت کے ثبوت پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں مولانا موصوف کے ابوالاب کا، دوسری فصل میں ام الاب کا، تیسری فصل میں ابوالام کا، چوتھی فصل میں ام الام اور پانچویں فصل میں قریبی قرابتداروں کے نسب کا بیان ہے۔ اور خاتمہ میں چند متفرق امور اور شجرۂ بیعت کا تذکرہ ہے۔

میرے سامنے کتاب کی پہلی اشاعت ہے جو کلکتہ کے ہادی المطابع میں ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں طبع ہوئی ہے۔

اس اشاعت کے مطابق کتاب کے صفحات کی تعداد مع فہرست مضامین ۲۸۸ ہے، اور ۴ صفحات میں تصحیح اغلاط ہے۔

مقدمہ ص ۳ سے شروع ہو کر ص ۶ پر ختم ہوا ہے۔

فصل اول کے مضامین ص ۶ سے ص ۳۳ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

فصل دوم ص ۳۴ سے شروع ہو کر ۱۶۶ پر ختم ہوئی ہے۔

فصل سوم ص ۱۶۶ سے ص ۱۸۷ تک پھیلی ہوئی ہے۔
فصل چہارم ص ۱۸۸ سے ص ۲۳۸ تک پھیلی ہوئی ہے۔
فصل پنجم ص ۲۳۸ سے شروع ہو کر ص ۲۶۰ پر ختم ہوئی ہے۔
ان فصلوں میں اصلاً جن اصحاب کے تراجم مذکور ہیں ان کی تعداد ایک سو گیارہ ہے، ضمناً جن کا ذکر آگیا ہے ان کی تعداد علیحدہ ہے۔

اور خاتمہ ص ۲۶۰ سے ص ۲۷۳ تک گیا ہے، اور اس کے بعد مختلف شعراء کے ۲۴ قطعاتِ تاریخ درج ہیں جن میں کتاب کی تصنیف کے ہجری و عیسوی سنین کے ساتھ ساتھ کتاب و مؤلف کتاب کے محاسن کا شاعرانہ انداز میں ذکر ہے۔

قطعاتِ تاریخ سے پہلے ص ۲۷۱ تا ۲۷۳ پر تذکرۂ صادقہ پر مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کا تبصرہ ثبت ہے جس میں اس تصنیف اور مترجم لہم کو بہت سراہا گیا ہے، اور قطعات تاریخ کی ابتدا مولانا آزاد رحمہ اللہ ہی کے تین قطعوں سے کی گئی ہے۔

الدّر المنثور کی بعض خصوصیات کی نشاندہی

۱۔ دقت پسندی و تفصیل:

تذکرہ نگاری کا یہ کمال ہے کہ صاحب ترجمہ کے حالات کو دقت پسندی اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ تذکرۂ صادقہ میں ہمیں یہ خوبی متعدد ترجموں میں وضاحت کے ساتھ نظر آتی ہے۔

مولانا یحییٰ علی کے ترجمہ میں ان کے سفر افغانستان میں پیش آنے والی مشکلات، ان کے معمولاتِ یومیہ کے بیان اور پھر گرفتاری اور قید کے تذکرہ میں یہ دقت پسندی و تفصیل نمایاں ہے۔ انبالہ کی جس کوٹھری میں یہ لوگ قید تھے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہر ایک علیحدہ علیحدہ ایک ایک کوٹھری میں کہ جس کو سنگین کوٹھری کہتے ہیں، بند کئے گئے، وہ کوٹھری پانچ فٹ لانبی اور چار فٹ چوڑی ہوگی، اور چھت اس کی نہایت بلند، اور اوپر چھت کے ایک چھوٹا سا روشن دان تھا کہ آدمی اس میں

سانس لے سکے، نہایت تنگ و تاریک تھی، اس کوٹھری میں تخمیناً اڑھائی تین مہینے ہم لوگ رہے، جملہ گیارہ آدمی تھے، شب و روز میں ایک بار اس کا دروازہ کھلتا، اور ایک جمعدار اور دو تین سپاہی اور ان کے ساتھ ایک باورچی کہ جس کے ہاتھ میں روٹیاں اور دال ہوتیں، اور ایک مشکی کہ جس کے مشک میں پانی ہوتا، اور ایک بھنگی ہاتھ میں گملا لئے ہوئے آتا، اور ہر ایک کوٹھری کو کھولتا، باورچی دو روٹیاں اور کچھ دال دے دیتا، اور مشکی ایک کوزہ پانی دے دیتا، اور بھنگی گملا صاف کر دیتا، اور پھر یہ لوگ چلے جاتے، جو جو تکلیفیں اس میں گذریں اس کا بیان طول ہے اور فضول۔"

دقت پسندی و تصویر کشی کا یہ کمال مولانا ولایت علی کے ترجمہ میں بھی نمایاں ہے۔ ص ۹۴ پر مولانا موصوف کے اوائل عمر کا حال بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے، اس بیان میں تعبیر کے حسن کے ساتھ ساتھ عبرت و نصیحت کا پہلو بھی ہے، لکھتے ہیں:

"اوائل عمر میں بڑے بانکے تھے، آپ کا لباس پوشاک لکھنؤ کے بانکوں کا سا تھا، کاکلیں آہن تاب پشت پر پڑی ہوئیں، اونچی چولی کا انگرکھا مغرق بزر، اور چوڑی دار پائجامہ زری کے کام کا، ٹخنے ڈھکے ہوئے پہنا کرتے تھے، اپنے نانا رفیع الدین حسین خان، جو ناظم صوبہ دار از طرف نواب مرشد آباد تھے، کے بڑے لاڈلے تھے، اس واسطے ہر وقت عمدہ ریشمی و زرّیں لباس یا ڈھاکے کی جامدانی و تن زیب کا جوڑا آپ کے زیب تن رہتا تھا، خوشبو و عطریات کا بھی آپ کو بڑا شوق تھا، سونے کی انگوٹھیاں اور چھلے ہاتھوں میں پڑے رہتے تھے، لیکن سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہی آپ کا حال بدل گیا، مولانا اسماعیل شہید نے اپنی جماعت میں ان کو اپنا نائب مقرر کر دیا تھا، مگر جناب مولانا کو جو مزہ ایمانی حاصل ہوا تھا تو اپنی جماعت والوں کی آپ خدمت کیا کرتے تھے، اب وہ پٹنہ کے بانکے اور ناظم بہار کے لاڈلے خمر حب ایمانی سے مخمور ہو کر جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر اپنے سر پہ لایا کرتے تھے، کھانا اپنے ہاتھ سے

پکاتے، مٹی گارے کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے، اور جب اپنی جماعت کے کام سے فرصت پاتے تو سید صاحب کی صحبت میں جا بیٹھتے یا تنہا نماز اور دُعا میں مشغول رہتے۔"

۲۔ معنی آفرینی و حسنِ تعبیر:

تذکرۂ صادقہ میں جا بجا ہمیں معنی آفرینی و حسن تعبیر کے نمونے نظر آتے ہیں، یہ مصنّف کی زبان دانی اور جذبہ کی صداقت کا ثبوت ہے، قید و بند کی حالت میں مولانا یحییٰ علی کے وعظ و تبلیغ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ کا فیض کبھی کسی حالت میں بند نہ ہوا، آپ کا جسم مبارک قیدی تھا مگر آپ کے دل و زبان آزاد تھے، اس پر کسی کی حکومت نہ تھی بجز اس حاکم حقیقی کے، اگر دو منٹ کے واسطے بھی کوئی آدمی سامنے آجاتا آپ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بجالاتے۔"

گرفتاری کے بعد جب مقدمہ کی کارروائی کے لئے قیدیوں کو باہر نکالا گیا تو اس وقت کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بعد تین مہینے کے جب مقدمہ ہم لوگوں کا اجلاس میں صاحب مجسٹریٹ کے شروع ہوا اس وقت ہم لوگ گیارہ آدمی قبروں سے نکال کر ایک مکان حوالات میں جمع کر دیئے گئے، جو اسی جیل خانہ میں تھا، بعد تین مہینے کے جو ہم لوگوں نے آسمان کی صورت دیکھی اور ایک کو دوسرے سے ملاقات ہوئی از حد خوشی حاصل ہوئی، اس وقت حضرت مولانا (یحییٰ علی) کا صبر و استقلال قابل دید تھا، واقعی یہ ہے کہ اگر آپ کا ساتھ ہم لوگوں کا نہ ہوتا تو قدم ہم لوگوں کے ڈگ جاتے۔"

۳۔ انگریزوں کے ظلم کی تصویر:

تذکرۂ صادقہ کے مختلف مقامات پر انگریزوں کا تذکرہ "اولیاء نعمت" کے طور پر کیا گیا ہے، یا تو اس کا سبب مزید ظلم و ستم سے بچنے کا جذبہ ہے یا عفو و مسالمت کا وہ رجحان

جس کے لئے مسلمان مشہور رہیں۔ پھر بھی بعض مقامات پر مصنف نے انگریزوں کے اس ظلم و تعدی کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے جس کا شکار صادق پور اور دوسرے مقامات کے مجاہدین اور انگریزی حکومت کے دوسرے مخالفین ہوئے۔ مولانا یحییٰ علی پر انگریز حکام کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مجسٹریٹ انبالہ نے جیل میں آکر داروغہ کو حکم دیا کہ مولانا سے سخت تر مشقت لیجاوے، چنانچہ خود اس نے اپنے روبرو کھڑے ہو کر ایک بڑے کنویں پر جو رہٹ چل رہا تھا عین تمازت آفتاب میں اس رہٹ کو آٹھ دس قیدی چلا رہے تھے اور وہ بہ مشکل چلتا تھا، آپ کو بھی اس میں دے دیا، آپ دو تین روز تک تمام روز اس کو چلاتے رہے، آپ کو بباعث حرارت آفتاب خون کا پیشاب آنے لگا، آپ نہایت صبر و شکر کے ساتھ اس کو انجام دیتے رہے، دوسرے قیدی جو نہایت قوی و توانا تھے اس رہٹ کو کھینچتے، تھک کر بیٹھ جاتے، مگر آپ صبح سے شام تک اس میں لگے ہی رہتے۔" (ص ۶۸)

۴۔ آیات کا حسنِ اقتباس:

مصنف نے مختلف مقامات پر بڑی خوبصورتی اور چابکدستی کے ساتھ آیات اور عربی جملوں کا استعمال کیا ہے، اس سے آپ کی عالی ذوقی اور زبان و بیان کے رموز سے واقفیت و احاطہ کا پتہ چلتا ہے۔

قیدیوں میں سے کچھ لوگوں کو انگریزوں نے بہکا کر اپنے حق میں مجاہدین کے خلاف گواہی کے لئے آمادہ کر لیا تھا، یہ لوگ دوسرے مجاہدین کو بھی اس دامِ فریب میں پھنسانا چاہتے تھے، جیل میں انھیں جو سہولت حاصل تھی اس کے حوالہ سے مجاہدین کو ورغلاتے تھے، مولانا لکھتے ہیں:

"اور دوسرے ساتھیوں کو بھی ترغیب گواہی کی دینے لگے، (وقاسمہما انی لکما لمن الناصحین) کا دم بھرنے لگے۔" (ص ۶۹)

عام قیدیوں پر ظلم و ستم جاری تھا، اور انھیں عذاب الجوع کا سامنا تھا، لیکن

دوسری طرف انگریزوں کا ساتھ دینے والے اسی قید خانہ میں طرح طرح کے عیش و تنعم سے بہرہ ور تھے، لکھتے ہیں:

"گویا نمونۂ قیامت تھا کہ ایک طرف جنّت اور دوسری طرف دوزخ نظروں کے سامنے رکھی تھی، وہ وقت پرلے سرے کی جانچ اور امتحان کا تھا، اُس وقت پر آیت کریمہ "وزلزلوا زلزالاً شدیداً" کا مضمون خوب صادق آتا ہے، اور پُل صراط کی سی کیفیت تھی کہ ہر ذی ایمان "رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ" کہتا تھا۔"

۵۔ روایت میں احتیاط و صدق پسندی:

علماء اسلام کی ایک بڑی جماعت روایت میں احتیاط و دقت پسندی کے لئے مشہور ہے، احادیثِ نبویہ کی روایت اور عام معاملات میں اسلام نے صدق و دیانت کی جو تعلیم دی ہے اس کا جیتا جاگتا نمونہ ہمیں ان علماء کی تحریروں اور بیانات میں نظر آتا ہے ــــ مصنفِ تذکرۂ صادقہ نے بھی کتاب کے مختلف مقامات پر اس احتیاط و صدق بیانی کا نمونہ پیش کیا ہے۔ مولانا یحییٰ علی کو انبالہ جیل سے چھ آدمیوں کے ساتھ جب لاہور منتقل کر دیا گیا اور صاحبِ تذکرہ انبالہ ہی میں رہے۔ یہ جُدائی تقریباً دو سال قائم رہی، اس مدت کے واقعات کو قلمبند کرتے ہوئے مصنف نے تصریح کر دی ہے کہ مذکورہ دو سالوں کی جو کیفیت میں بیان کروں گا وہ سُنی ہوئی ہوگی، میں نے خود اس کا مشاہدہ نہیں کیا ہے۔ (ص ۷۰)

۶۔ تواضع و انکساری:

کسی مصنف کا اپنی تصنیف و تحریر سے متعلق کمی اور نقص کا اعتراف بڑی بات ہے، یہ خوبی انھیں لوگوں میں پائی جاتی ہے جو تواضع اور کسرِ نفسی کی صفت سے متصف ہیں۔ مصنفِ تذکرہ نے متعدد مقامات پر قلم کی کوتاہی، عجزِ بیانی اور فراہمی مواد کے نقص کا اعتراف کیا ہے، جب کہ ان کا تذکرہ اپنی حد تک بیحد جامع و مفصل ہے، یہ ان کی وسعتِ قلبی اور بے نفسی کی دلیل ہے۔

اس کی ایک مثال مولوی عبدالقدیر ایم، اے کے ترجمہ میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ مصنف نے ان کے حالات اور محاسن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"آپ مثل اپنے برادر معظم حکیم عبدالحمید صاحب کے نہایت ذہین و ذکی ہیں، ادب آپ کا نہایت عمدہ، معقولات میں دخل تام، عربی انگریزی دونوں زبانوں میں آپ کو پوری مہارت حاصل ہے، افسوس کہ باعثِ طوالت آپ کے ملفوظات کو میں اس جگہ لکھنے سے قاصر ہوں۔"

اس اعتراف سے ہمیں مصنف کے اس احساس کا پتہ چلتا ہے کہ ترجمہ میں صاحبِ ترجمہ کی تحریر کو پیش کرنا اور اس کی فکری کاوشوں کا نمونہ ذکر کرنا ترجمہ کے لئے باعثِ کمال ہے۔

۷۔ ملکی و سیاسی احوال کا تذکرہ :

خاندانِ صادقپور کی سرگرمیوں کا براہ راست سیاست سے تعلق تھا، انگریزوں اور سکھوں کے خلاف اس خاندان کے لوگوں کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ مصنف نے مختلف ترجموں میں اس طرح کے احوال کا ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ بعض مقامات پر عام ملکی و سیاسی احوال بھی زیر تذکرہ آئے ہیں، مثلاً ص ۹۸ پر نواب مبارز الدولہ اور ان کے بھائی ناصر الدولہ کے مابین ناچاقی کا ذکر کیا ہے جس میں انگریزوں کی مداخلت تک نوبت جا پہنچی ہے۔

۸۔ اصلاحی کاموں کا ذکر :

کسی بھی تذکرہ کی یہ خوبی ہے کہ اس سے قاری کو فکری و عملی غذا حاصل ہو، اور اس کے سامنے محاسن و فضائل کے ایسے مرقعے پیش کئے جائیں جن سے وہ اپنی عملی زندگی کو سدھار سکے۔ شعراء و ادباء کے تذکروں میں اس پہلو کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، لیکن علماء و مصلحین کے تذکروں میں اس پہلو کو خاص اہمیت حاصل ہے، تذکرہ صادقہ کے مصنف نے ہر ترجمہ میں اس کا بے حد خیال رکھا ہے، وہ حتی الامکان صاحب ترجمہ کے علمی و اصلاحی کمالات اور نجی زندگی کی خوبیوں کو نمایاں کرتے ہیں۔ مولانا ولایت علی کے

ترجمہ میں لکھتے ہیں:

"بڑے حضرت (ولایت علی) کا دستور تھا کہ بعد نماز صبح خود لوگوں کو توجہ دیتے، بعد نماز ظہر درس دیتے، صدہا مریدوں کا ہجوم ہوتا، عصر تک یہی مشغلہ رہتا۔"

"انھیں دنوں میں ایک اور سنت پر آپ نے عمل کیا، ایک شخص عبدالغنی نام ساکن نگر نہسہ جو بہت عرصہ سے قافلہ میں رہا کرتے تھے، اور ایک عورت بیوہ وہ بھی زنانہ مکان میں عرصہ سے تھی، ان دونوں کا نکاح آپ نے کر دیا، اور مہر تعلیم قرآن آپ نے مقرر کیا۔ اسی عرصہ میں ایک اور سنت حضرت نے ادا کی، وہ یہ کہ یہاں کے شریفوں میں دستور تھا کہ جب تک زوجۂ اولیٰ زندہ رہتی کوئی برادری والا اس کی دوسری شادی کے واسطے اپنی بیٹی نہ دیتا تھا، اس رسم کو بھی آپ نے توڑا، مسماۃ رشیدن بنت حکیم احمد علی کی شادی ساتھ مولوی فرحت حسین کے باوجود موجودگی زوجۂ اولیٰ کے کر دی۔"

"الغرض آپ کا خیال تھا کہ جہاں تک ہو سکے ہر چھوٹی بڑی سنت ادا کی جاوے۔"

۹۔ فنون سپہ گری کا ذکر:

انسان کے محاسن میں شجاعت و بہادری ایک اہم خوبی ہے، اس کی شخصیت کی تشکیل میں اس وصف کی تاثیر بہت نمایاں ہے، قوم جب حالتِ جہاد میں ہو تو اس وصف کی اہمیت میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ خاندان صادقپور انگریزوں سے برسرِ پیکار تھا، تاریخ میں اس خاندان کو جو عظمت و مکرمت حاصل ہوئی اس کا سبب یہی جہاد اور اس راہ کی قربانیاں تھیں۔ مصنفؒ تذکرۂ صادقہ نے اسی لئے مختلف ترجموں میں صاحب ترجمہ کی شجاعت و بہادری اور جنگی استعداد و صلاحیت کا بھی ذکر کیا ہے، اپنے والد مولانا فرحت حسین کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

"آپ فنونِ حرب میں خوب مہارت رکھتے تھے، سواری اسپ نہایت عمدہ

جانتے تھے، اکثر آپ نہایت بد ذات و شریر گھوڑوں پر سوار ہوتے، اور ان کو رام بنا کر چھوڑتے، بندوق کا نشانہ ایسا عمدہ جانتے تھے کہ اڑتی چڑیا آپ کے نشانہ سے خالی نہ جاتی، پٹہ اور بانک اور بانا بھی خوب جانتے تھے، آپ اپنے مکان کے باغچہ کی روش میں کرسی بچھا کر بیٹھ جاتے اور ہاتھ میں گدکا لے لیتے اور چار پانچ آدمی کھڑے ہو کر آپ پر چھوٹ کا ہاتھ چلاتے اور آپ سے چھوٹ لڑتے، آپ دوسروں کے وار سے بچتے اور اپنا وار دوسروں پر لگا دیتے۔ دریا کی سیاحت میں بھی آپ خوب ماہر تھے، قسم قسم کی پیرائی آپ کرتے تھے، کھڑے اور بیٹھے اور چت۔ بالجملہ ہر ہر فن میں سپہ گری کے آپ خوب مشاق دیکھ و تاز تھے۔"

۱۰۔ تعلیمی کوششوں کی ستائش:

مولانا عبدالرحیمؒ انگریزی زبان اور عصری علوم سے واقف نہ تھے، لیکن ان کے جن اعزّا نے اس میدان میں کامیابی حاصل کی تھی اور تعلیم کے فروغ کے لئے کوشاں تھے اس کا ذکر انھوں نے بڑی وسعت قلبی اور دور اندیشی کے ساتھ کیا ہے، مولانا ولایت علی کے لڑکے مولوی محمد حسن کے محاسن کا ذکر کرتے ہوئے تعلیمی میدان کی ان کی تگ و دو کو سراہا ہے، لکھتے ہیں:

"مولوی صاحب مرحوم یکم مارچ ۱۸۸۴ء کو ایک اسکول محمڈن اینگلو عربک اسکول کے نام سے جس میں مسلمانوں کے لڑکوں کو انگریزی اور عربی و دینیات دونوں کی تعلیم دی جائے، قائم کیا تاکہ مسلمان علوم مغربیہ سے اپنے دماغوں کو روشن کریں اور ان کے متعصبانہ خیالات دفع ہوں، اور علوم دینیہ سے اپنے مذہبی امور کی پابندی میں مستحکم رہیں، جو ان کے لئے ایک ناگزیر اور ضروری چیز ہے۔"

اسی اسکول کے متعلق مولوی صاحب موصوف کے ارادہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولوی صاحب کا قصد تھا کہ اسکول کو ترقی دے کر کالج تک پہونچائیں، اور اس کے متعلق ایک وسیع اور با آسائش دار المقامہ بنوائیں، مگر افسوس کہ

موت نے ان کی کل آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا، جی کی بات جی میں رہی۔
دو ہفتہ تپ محرقہ و لرزہ میں مبتلا رہ کر ۷ ربیع الاول ۱۳۰۷ھ کو رہگرائے
ملک بقا ہوئے۔"

۱۱۔ انسانی فضائل و محاسن کا تذکرہ:

سوانح کا افادی پہلو یہ ہے کہ صاحب سوانح کے محاسن و کمالات کا تذکرہ اس انداز سے کیا جائے کہ کسی مبالغہ کے بغیر اس میں دوسروں کے لئے نصیحت و رہنمائی ہو۔ تذکرۂ صادقہ میں زیادہ تر شخصیتوں کا تذکرہ اسی انداز سے کیا گیا ہے، ص ۱۷۸ پر حکیم مولوی ارادت حسین کے تذکرہ میں ان کے محاسن کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علم و حساب و ریاضی میں آپ کو کمال دخل تھا، مناسخہ بہت بڑا بڑا آٹھ آٹھ اور نو نو بطن کا تو آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، فن طب میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا، تشخیص مرض اور اسلوب علاج نہایت عمدہ تھا، دست شفا تو ایسی اللہ نے دی تھی کہ لوگ اس کو کرامات سمجھتے تھے، ہزاروں مایوس العلاج نے آپ کے ہاتھوں سے صحت پائی، تمام ہندو مسلمان، شیعہ و سنی آپ کے نسخوں کو تبرک سمجھ کر نہایت عقیدت سے لیتے اور استعمال کرتے، روزانہ پانچ چھ سو نسخوں سے کم نہیں ہوتا تھا جو آپ کے مطب سے تقسیم پاتا تھا۔ ایسی بھیڑ بھاڑ اور ہجوم مستعجلین تو کسی طبیب کے دروازے پر دیکھا نہ سنا۔ اس کے ساتھ مریضوں کے ساتھ شفقت اور محبت ایسی کہ لوگ اپنے والدین کو بھول جاتے۔"

۱۲۔ رفاہی کاموں کی ستائش:

کسی سوانح میں عوامی فائدہ کے اعمال و امور کا تذکرہ مصنف کی وسعت نظر کی دلیل ہے، اور اس سے ترجمہ کی افادیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ حکیم مولوی ارادت حسین صاحب نے دوسری بار ۱۲۸۱ھ میں حج کیا، اور وہاں پر تیرہ برس تک مقیم رہے اس مدت میں وہاں ان کے ہاتھوں سے متعدد رفاہی کام انجام پذیر ہوئے، مصنفؒ نے اس کا تذکرہ

کرتے ہوئے لکھا ہے:

"حجاج سے چندہ کرکے لاکھوں روپیہ خرچ کرکے نہر مصر کو صاف کرایا، منیٰ میں رمی جمرات کے پاس سڑک جو تھی نہایت تنگ تھی، لاکھوں آدمیوں کا گذر اس سڑک سے واسطے رمی جمرات کے ہوتا، اور آگے اس سڑک کے نکلنے کی جگہ نہیں تھی، جو رمی کو جاتا اس کو رجعت قہقری کرنی پڑتی، اکثر خون ہوا کرتا، ضعیف و کمزور پامال ہوا کرتے، آپ نے چندہ کرکے وہاں کے شریف و پاشا کی مدد سے پہاڑ کھدوا کر سڑک کو نہایت وسیع کرا دیا اور جمرات کی پشت پر سے ایک سڑک نکال دی کہ جس سے لوگ ایک طرف سے آویں اور رمی کرتے ہوئے دوسری طرف سے نکل جاویں، مراجعت کی زحمت نہ پڑے، اس انتظام سے ایک ایسی عمدگی ہوگئی اور ایسا آرام لوگوں کو ملا کہ جن لوگوں نے کہ پہلے اس مقام کی تنگی و اژدحام کی کیفیت دیکھی ہے وہی اس کو خوب سمجھ سکتے ہیں۔" (ص ۱۸۰)

اس موقع پر مزید رفاہی کاموں کا بھی ذکر کیا ہے جس سے صاحب ترجمہ کی خیر پسندی اور مصنفؒ کی وسعت نظری کا ثبوت ملتا ہے۔

۱۳۔ خاندانِ صادقپور کا حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ جو تعلق قائم ہوا وہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے، حضرت شہیدؒ کی حیات میں اس خاندان کے افراد نے آپ کی دعوت و تحریک کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرکے ایک مثال قائم کی، اور اس کے بعد بھی ایک عرصہ تک اس دعوت کو سینچتے اور سنبھالتے رہے، اس عزیمت و قربانی کی مثالیں آج بھی کہیں کہیں دیکھنے کو ملتی ہیں، اور جو چیز سب محسوس کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ حضرت سید شہیدؒ کا قدم جہاں پڑ گیا یا جو لوگ آپ کی بے مثال شخصیت کے ساتھ کسی طرح وابستہ ہوگئے ان کی زندگی بلاشبہ اسلامی سانچہ میں ڈھل گئی، اور عقیدہ و عمل کی دنیا میں انقلاب پیدا ہوگیا، اور ہمیشہ کے لئے شرک و بدعت سے ان کو نفرت ہوگئی۔

حضرت سید شہیدؒ کی دعوت کی اسی تاثیر کے سبب اس کے ساتھ ربط و تعلق کو علماء نے اپنی تحریر و تقریر میں نمایاں کیا ہے، بہت سے علاقوں میں توحید و سنت کی اشاعت اور شرک و بدعت کے خاتمہ کی بابت جب سوال کیا جاتا ہے تو آج بھی لوگ بڑی وضاحت سے یہ اعتراف کرتے ہیں کہ یہ سید شہید رحمہ اللہ کی دعوت کی برکت ہے، آپ کا قافلہ فلاں وقت میں اس طرف سے گذرا تھا۔ دریا گنگا کے کنارے آباد جن شہروں اور بستیوں سے آپ یا آپ کے رفقاء گذرے ان کے حالات آج بھی ان بستیوں سے مختلف ہیں جہاں آپ کی دعوت و تحریک کے اثرات کسی وجہ سے نہ پہونچ سکے۔

مصنف تذکرۂ صادقہ نے دعوت شہید کی اس اہمیت کو محسوس کرنے کی ہی وجہ سے متعدد ترجموں میں یہ وضاحت کی ہے کہ صاحبِ ترجمہ کو حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت حاصل تھی، مثلاً ص ۲۰۶ پر مولوی محمد ذکی کا ترجمہ، ص ۲۰۹ پر شاہ محمد حسین کا ترجمہ اور ص ۲۱۴ پر شاہ محمد کریم کا ترجمہ۔

اسی اہمیت و تاثیر کے باعث مصنف نے ص ۲۶۰ پر اپنا شجرۂ بیعت ذکر کیا ہے، اور چشتی، قادری و نقشبندی سلسلوں سے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچایا ہے۔

۱۴۔ سوانح میں حلیہ اور سراپا کا ذکر بھی اہمیت رکھتا ہے، مصنفؒ نے مختلف ترجموں میں صاحبِ ترجمہ کا حلیہ دقت و وضاحت سے بیان کیا ہے، شیخ قمر علی کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

"آپ نہایت کشیدہ قامت اور جسیم تھے، ایسا کہ اگر ہزار بارہ سو آدمی میں آپ کھڑے ہوتے تو آپ کا سر اونچا ہوتا۔"

شاہ محمد حسین کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

"حلیہ شریف یہ ہے: قد میانہ، رنگ نہایت گورا صاف بلند، نقشہ نہایت خوبصورت، آپ نہایت حسین تھے۔"

مولانا محمد سعید کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ:

"حلیہ شریف آپ کا یہ ہے: قد میانہ، رنگ گندم گوں، داغ جدری

چہرۂ انور پر بکثرت، داڑھی بہت خوبصورت اوسط درجہ کی، نہ بہت ہلکی، بدن پر گوشت۔"

۱۵۔ ص ۲۳۴ پر شاہ نصر اللہ و شاہ تاج الدین کے تذکرہ میں اس شاہی فرمان کا تذکرہ ہے جو موصوفین کو اورنگ زیب عالم گیرؒ سے ملا تھا۔ تاریخی اعتبار سے اس مسئلہ کی اہمیت اہل علم سے مخفی نہیں۔

۱۶۔ مردوں کے تذکرے میں مصنفؒ نے جس طرح محاسن و کمالات کا احاطہ کیا ہے اسی طرح خواتین کے تذکرہ میں بھی ان کے اوصاف حسنہ کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے، مثلاً ص ۲۵۳ پر قاضی اسد علی کی لڑکی بی بی نجیبن کا ترجمہ جو مصنف کی سوتیلی ماں تھیں۔

۱۷۔ مصنفؒ نے مختلف ترجموں میں اصحاب تراجم کے یا ان سے متعلق دوسرے علماء و شعراء کے قصائد و اشعار ذکر کئے ہیں۔ مناسباتی و فرمائشی اشعار سے متعلق ناقدین کی رائے اچھی نہیں ہے، لیکن جن اشعار کو مصنف نے ذکر کیا ہے ان میں بہت سے اشعار فنی محاسن کے حامل ہیں، اور ان میں مضمون آفرینی و حسن تعبیر کی خوبی موجود ہے۔

مصنف کی اس توجہ سے یہ اشعار محفوظ ہو گئے، ورنہ معلوم نہیں کب اور کہاں ضائع ہو جاتے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

تذکرۂ صادقہ کی جن حیثیتوں اور خصوصیتوں کا میں نے اب تک ذکر کیا ہے ان کو تصویر کا ایک رُخ کہہ سکتے ہیں، لیکن ہر تصنیف کی طرح اس تذکرہ میں بھی کچھ باتیں ایسی ہیں جن پر کسی نہ کسی حیثیت سے نقد و جرح ہو سکتی ہے۔

مثلاً مصنف نے بعض ترجموں میں کشف قبور و مراقبہ کی بعض ایسی کیفیتوں کا ذکر کیا ہے جو محل نظر ہیں۔

اسی طرح جماعت اہل حدیث کی انگریزوں کے ساتھ وفاداری اور ۱۸۵۷ء کے واقعات واحوال سے ان کی کنارہ کشی کا مسئلہ بھی ہے۔ مقام تعجب ہے کہ مصنف کو بیس سال تک جلاوطنی کی زندگی گذارنی پڑی، ان کا پورا محلہ انکی آنکھوں کے سامنے انگریزوں کے ظلم وستم کی داستان سُنا رہا تھا، وہاں کے مکانات کو منہدم کر کے سرکاری عمارتیں بنادی گئی تھیں، داستانِ اہلِ صادق پور انگریز دشمنی کا عنوان سمجھی جاتی تھی، سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کا رُخ بنیادی طور پر انگریزوں کی طرف تھا، اور اسی لئے وہ لوگ اس تحریک سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کے جانی دشمن تھے اور اس تحریک کا ہر فرد بھی انگریزوں کے یکسر خلاف تھا، پھر مصنف کے اس بیان کی تصدیق کیوں کر کی جاسکتی ہے کہ جماعت اہل حدیث انگریزوں کے خلاف شورش سے کسی بھی طرح کنارہ کش تھی، انگریزوں کے استبداد اور ظلم وتعدی سے بچنے کے لئے مصنف نے یہ اسلوب اختیار کیا ہوگا۔

مذکورہ امور علمی وتاریخی لحاظ سے محتاج نظر ہیں، لیکن اس مقالہ میں ان پر اظہار خیال بخوف طوالت ملتوی کیا جاتا ہے، کسی اور موقع پر ان پر اظہار خیال کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ انتہیٰ۔

(ڈاکٹر) محسن عثمانی ندوی

کلامِ اقبال میں شہادت کا رنگ

سرِ خاکِ شہیدِ برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملّتِ ما سازگار آمد

بعض ناقدین نے اقبال کے پیغام کو حالی کے کام کی تکمیل قرار دیا ہے۔ اور حالی کے کلام میں تحریک تجدید دین کا عکس اور رنگ پایا جاتا ہے۔ اس صغریٰ اور کبریٰ کے بعد اس نتیجے کے نکالنے میں بھی آسانی پیدا ہو جاتی ہے کہ کلام اقبال کا رشتہ تحریک جہاد و اقامت دین سے موجود ہے۔ کلام اقبال اور سیرت سید احمد شہیدؒ کے درمیان حیرت انگیز حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس معنوی رشتے اور مناسبت کو ہر وہ شخص محسوس کرے گا جس نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی سیرت اور کلام اقبال دونوں کا مطالعہ کیا ہو۔ دونوں کے یہاں فکر و تصور کی ہم آہنگی اتنی نمایاں ہے کہ اقبال کی بہت سی نظموں کو حضرت سید احمدؒ کی تحریک کا شعری پرتو کہا جا سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ان کا روحانی تصرف تھا کہ پنجاب کی سرزمین سے اقبال کی روح رجز خواں ہوئی۔

اس بے مثل مماثلت اور مناسبت کی توجیہہ میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مرد خدا کے عمل اور شاعر اسلام کے کلام کا منبع اور سرچشمہ ایک ہے۔ ایک کی جدت کردار اور دوسرے کی لذّت گفتار نے ایک ہی سرچشمہ سے فیض پایا ہے۔ ایک کی قوت عمل اور دوسرے کی نظم و غزل میں ایک ہی حقیقت کا اظہار ہے۔ توجیہ تلاش کرنے میں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اقبال کشمیری الاصل والنسل تھے۔ مسقط راس پنجاب تھا، تعلیم و تربیت کا زمانہ لاہور میں گذرا۔ مولوی میر حسن آرنلڈ اور سر عبدالقادر جیسے اہلِ دانش و بینش سے تلمذ و ارتباط تھا۔ یہ تمام قرینے اس بات کے

ہیں کہ انھوں نے پنجاب و کشمیر اور افغانستان میں سکھوں کے ظلم و زور اور ان سے سید احمد شہیدؒ کے جہاد اور تجدید امامت کی داستان سنی اور پڑھی ہوگی۔

حضرت سیدؒ کی شہادت اور اقبال کی ولادت کا زمانی فاصلہ بھی زیادہ نہیں۔ شاعری تو شعور کے سمو و ترفع کا نام ہے۔ اور شاعر کا سب سے ضروری کوالیفکیشن یہ ہے کہ اس کے اندر احساس و شعور کی شدّت پائی جائے۔ اقبال کے تاریخی اور ملّی شعور پر یہ الزام ہوگا اگر کہا جائے کہ اُن کے آئینۂ دل میں اس عظیم الشان تحریک کا جس کی جامعیت کی نظیر گذشتہ کئی صدیوں سے تاریخ میں نہ ملے گی، کوئی عکس نہ پڑا ہو اور وہ اس سے ناواقف اور غیر معترف رہے ہوں۔

اس مقالہ میں صرف اس مماثلت کو پیش کرنا مقصود ہے۔ جو سید احمد شہیدؒ کی سیرت اور کلام اقبال میں پائی جاتی ہے اور یہ مماثلت اتنی نمایاں ہے کہ حضرت احمدؒ کی تحریک کے سب سے بڑے واقف کار اور ادا شناس نے اپنی سیرت کی کتاب شروع کرنے سے پہلے نقوش اقبال کو زیب قرطاس کیا "سیرت احمد شہیدؒ" کے آغاز میں اقبال کے یہ فارسی اشعار موجود ہیں ؎

قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گِل کوشند
ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بجلوت اند و کمندے بمہر و مہ پیچند
بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند
بروزِ بزم سراپا چو پرنیاں و حریر
بروزِ رزم خود آگاہ و تن فراموشند
نظامِ تازہ بچرخِ دو رنگ می بخشند
ستارہ ہائے کہن را جنازہ بر دوشند

سیرت احمد شہید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت افغانستان اور میدانِ کارزار میں نکلنے سے پہلے ایک عرصہ تک آپ نے اپنے حلقۂ ارادت متوسلین اور اہل تعلّق کو ذکر الٰہی اور شوق عبادت کے ساتھ مجاہدانہ زندگی کی تربیت دی تھی۔ جہاد زندگانی اصل ایمان کی طاقت کا سرچشمہ یہی دو چیزیں ہیں۔ ایک ایمانی کیفیات اور دوسرے سپاہیانہ زندگی۔ حضرت سیدؒ

کی سیرت میں یہ دونوں نقوش سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ آپ عارف کامل بھی تھے اور امیر عساکر بھی اور اسی کے ساتھ امیر المومنین بھی۔ آپ نے اپنے حلقہ کے لوگوں کی عسکری تربیت بھی کی تھی۔ مولانا ولایت عظیم آبادی نازونعم میں پروردہ تھے اور خوشحال اور رئیس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن سید والا گہر کی جماعت میں شریک ہو کر محنت کوشی کے عادی ہو گئے تھے، اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر سر پر لاتے تھے، جامہ زیبی اور خوش لباسی ترک کر دی تھی۔ اقبالؔ کے کلام میں اس انداز تربیت کا پرتو محسوس ہوگا۔ اور حد سے بڑھی ہوئی نزاکت شیشہ گری، تہذیب کی خوش جمالی اور عیش و تنعم کی زندگی کی مخالفت قدم قدم پر نظر آئے گی۔ اقبالؔ کہتے ہیں:

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

دونوں کے تصور تربیت میں مماثلت کے لیے ان اشعار کو بھی سامنے رکھیے۔

اے اہل حرم رسم و راہ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت — دے اُن کو سبق خود شکنی خود نگری کا
توان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے — مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا

اقبالؔ جل ترنگ کے نہیں بلکہ لہو ترنگ کے قائل ہیں۔ وہ متمدن علاقوں کی خوش حالی اور خوش جمالی کے مقابلہ میں کوہستانوں اور چٹانوں اور دشوار گزار پہاڑوں کی زندگی کو پسند کرتے ہیں

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی — یا بندۂ صحرائی یا مرد کوہستانی

سیّد احمد شہیدؒ ہزارا اور پنج تار کے کوہستانی علاقوں میں اپنے قافلے کے ساتھ گزرے تھے۔ اور یہاں کے سربلند پہاڑوں کے دشوار گزار راستے، اس کوکبۂ شہریار کے روندے ہوئے تھے۔ وہ فطرت کے مقاصد کے نگہبان تھے۔ ان کی زندگی جہاد پیہم اور تکبیر مسلسل سے عبارت تھی، ان کی زندگی میں کبھی فراغت کے دن اور استراحت کی راتیں نہیں آئیں۔ ان کی سیرت جامِ شریعت سندانِ عشق، اصلاح و انقلاب اور شمشیر و سناں سے عبارت ہے۔ ان تمام خصوصیات کا اجتماع شخص واحد میں دیکھنے کے لیے چشم فلک کو سیکڑوں سال کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

آپ کی سیرت کا روشن اور تابناک پہلو درویشی اور فقیرانہ زندگی ہے یہ وہ کیفیت و حال ہے جو اللہ کی ربوبیت پر عزمِ متزلزل یقین اور مقام توکل پر فائز ہونے کے بعد اہل دل کو نصیب ہوتا ہے۔ اور نازک وقت اور عسرت کی حالت میں بھی مال و دولت کو مخلوق پر لٹانے اور ٹھکانے لگانے پر ہمت بخشتا ہے۔ یہ وہ قلندری ہے جو مال و منال اور جاہ و جلال پر نگاہ غلط انداز ڈالنا بھی پسند نہیں کرتی۔ یہ وہ درویشی ہے جو سلطان کو خاطر میں نہیں لاتی اور ناتربیت یافتہ اہلِ زر کی بڑی سے بڑی پیش کش کو ضرورت کے باوجود ٹھکرانے پر آمادہ کرتی ہے۔ جب خدا کی راہ میں نکلنے پر آسانیوں اور مہمانیوں کا وعدہ ہو چکا ہو، جب نگاہِ نازدل کو آشنائے راز کر چکی ہو پھر درویشی میں سلطانی اور فقیری میں امیری کا انداز اور دبدبہ ملتا ہے۔ اور درویش خدامست کی قوت بے پناہ ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ ساحل مقصود تک پہونچنے کے لئے اور اپنے قافلے والوں کو پہونچانے کے لیے دوسروں کے سفینوں پر بھروسہ نہیں کرتا اور ریگستان کی ریگ کے برابر بھی اس کے یہاں ہجوم خلائق ہو تو وہ اندیشہائے دور دراز میں گرفتار نہیں ہوتا۔ یہ کیفیت جو سیّد احمد شہیدؒ کی زندگی میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے اقبال کے بندۂ مومن کی قوتوں کا عیار ہے۔ یہی وہ فقیری ہے جس سے اقبال کے نزدیک باطن کی دنیا آباد اور روح کی زمین شاداب ہوتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔ ؎

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے — وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روح قرآنی
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی — یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی

یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار — اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سبحانی
یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے — کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہاں بانی

بال جبریل کی ایک نظم بعنوان فقر میں اقبال نے فقر کی دو قسمیں بیان کی ہیں ایک وہ فقر ہے جو سر افگندگی اور سر بزیری سکھاتا ہے اور دوسرا فقر وہ ہے جس سے فقیر کے قلب پر اسرار جہانگیری منکشف ہوتے ہیں۔ سید احمد شہیدؒ کی زندگی اس دوسرے فقر سے عبارت ہے انھوں نے امامت وخلافت کی بنیاد رکھی۔ اسلامی حکومت قائم کی۔ شریعت کے قوانین نافذ کیے۔ ان دونوں فقر کی تصویریں ان اشعار میں ملاحظہ کیجیے ؎

ایک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری — ایک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
ایک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری — ایک فقر سے مٹتی ہیں خاصیت اکسیری
ایک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری — میراثِ سلیمانی سرمایۂ شبیری

اقبال کے نزدیک فقیری اور درویشی کا یہ مقام ایمان سے حاصل ہوتا ہے، کہتے ہیں ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے — وہ درویشی کہ جسکے سامنے جھکتی ہے فغفوری

حضرت سید احمدؒ کی سیرت کا نمایاں پہلو کارزار حیات میں جستجو، سعی پیہم اور اقدام ہے۔ آپ کی زندگی میں گوشہ نشینی، سکون پرستی، عافیت کوشی کا نام ونشان نہیں ملتا۔ آپ نے اتباع شریعت اور استیصال بدعت کا کام کیا۔ اور دلوں میں عشق الٰہی کی آگ جلائی۔ لیکن یہ کام خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات کے ذریعہ نہیں بلکہ وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کے ذریعے کیا۔ اقبال کے یہاں بھی اس حرکت وعمل اور جذبت وصولت کا پیغام ملتا ہے۔ اقبال کے مرد فقیر، مرد صوفی، مرد درویش، مرد قلندر اور مرد مومن کا مصداق سید احمد شہیدؒ کی سیرت رکھنے والی شخصیت ہے۔ اقبال کے نزدیک اصل فقر وہ ہے جس سے سینۂ امکاں میں تلاطم برپا ہوتا ہے غلط طور پر لوگوں نے اسے ترک دنیا اور عزلت گزینی کا مرادف سمجھ لیا ہے۔ ؎

کچھ اور چیز ہے شاید تری سلیمانی — تری نگاہ میں ہے ایک فقیر و رہبانی
سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بے زار — فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
یہ فقر مرد قلندر نے کھو دیا جب سے — رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

سیرت سید احمد شہیدؒ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ مجاہد کبیر مجدد اسلام حضرت سید احمد شہیدؒ ہماری طویل و عریض تاریخ کے ان یگانہ و منتخب افراد میں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان و احتساب رضائے الٰہی اور ثواب اخروی کے شوق و یقین کی دولت خاص سے نوازا تھا اور ریا اور حب جاہ کی آلائشوں سے ان کے دلوں کو پوری طرح پاک و صاف کر دیا تھا۔ اور جن کی نگاہ میں دنیا اور اس کی زیب و زینت اور جاہ منصب کی قیمت، مور و مگس اور خار و خس سے زیادہ نہ تھی۔ اقبال نے مرد درویش کا جو تصور پیش کیا ہے اس میں بھی اس صفت اور خصوصیت کا تذکرہ کیا ہے ؎

ہے گراں سیر غم راحلہ و زاد سے تو — کوہ دریا سے گذر سکتے ہیں مانند نسیم
مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ — ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر و سیم

کیا بات ہے کہ صاحب دل کی نگاہ میں — جچتی نہیں سلطنت روم و شاہ

سید صاحبؒ کے بہت سے کارناموں میں ایک اہم بالشان کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جہاد فی سبیل اللہ کے رکن کو زندہ کیا یہ سنت ایک عرصہ سے متروک تھی اور اسے ناقابل عمل سمجھا جانے لگا تھا۔ آج بھی ایسے اہل قلم موجود ہیں جو جہاد اور جماعت مجاہدین کی مخالفت کرتے ہیں اور قلم کو اس کا نعم البدل قرار دیتے ہیں۔

سید صاحب کے اس کارنامہ کو سامنے رکھ کر جہاد پر اقبال کی نظم ملاحظہ کیجئے ؎

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے — دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جناب شیخ کو معلوم کیا نہیں — مسجد میں اب وعظ ہے بے سوز و بے اثر
تیغ و تفنگ دست مسلماں میں ہے کہاں — ہو بھی تو دل ہی موت کی لذت سے بے خبر
کافر کے موت سے ہی لرزتا ہو جس کا دل — کہتا ہے کون اسے کہ مسلماں کی موت مر
تعلیم اس کو چاہیے ترک جہاد کی — دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے — یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے — مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگذر

آخر میں مقصد جہاد، مقصود شہادت اور زہد و جہاد کے سلسلے میں کامیابی کو لیجئے، بہت سے اہلِ علم اور اہلِ قلم سے یہ غلطی سرزد ہوگئی ہے کہ انھوں نے دنیوی فتح و کامرانی کو مقصود اور اصل کامیابی سمجھ لیا ہے اور دنیا کی دوسری تحریکوں اور کوششوں کو ناپنے کے جو پیمانے بنے ہوئے ہیں اسی پیمانے سے دینی اور اسلامی کوششوں بلکہ کبھی کار نبوّت کو بھی ناپ دیا۔ حالانکہ دوسری تحریکوں کے ناپنے کا جو پیمانہ ہے وہ پیمانہ پیغمبرانہ کاموں کے ناپنے کا نہیں ہو سکتا۔ اس نفسیاتی یا فکری غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے قلم سے وہ الفاظ نکل گئے جو اسلام کے صحیح تصوّرِ جہاد اور تصوّرِ کامرانی و فلاح سے مختلف تھے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے نزدیک اصل چیز اتباعِ شریعت ہے نہ کہ اس کا نتیجہ۔ حکم الٰہی کی تعمیل میں اور رضائے الٰہی کی امید میں ملک کے ہاتھ سے نکل جانے کو ملک کے فتح ہو جانے سے زیادہ نفع بخش سودا سمجھنا حقیقت اسلام ہے۔ خدا کی بارگاہ میں نہ تو مقاصد کی دنیوی کامیابی کا سوال ہے اور نہ کوششوں کے ظاہری نتائج کا مطالبہ اور نہ سلطنت کے عدم قیام پر کوئی محاسبہ، وہاں کی میزان میں صرف دو چیزوں کی قیمت ہے ایک صدق و اخلاص اور دوسرے تا امکان جد و جہد۔ اقبال کے چند اشعار اس موضوع پر ملاحظہ کیجئے ؎

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانہ کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بے زار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست
زندگی اور بھی تیرے لیے دشوار کرے
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فتنۂ ملّتِ بیضا ہے امامت اس کی

جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

طارق کی دعا کے عنوان کے تحت اقبال کے جو اشعار ہیں وہ اسی تصورِ جہاد کے آئینہ دار ہیں ؎

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم اُن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!
خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیئے اس کو خونِ عرب سے

بقیہ صفحہ ۱۱۶ سے آگے :-

شاہ اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان کا . . . . .

کافی ہے کہ تقویۃ الایمان بیسیوں بار چھپی، اور آج بھی اپنے موضوع میں بہترین طرز ادا ہے۔ اس کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ شاہ صاحب کی اس تحریر کے زیر اثر سینکڑوں رسالے اور مضامین لکھے گئے جن میں ان کی فکر و زبان دونوں کا اثر پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر طفیل احمد ندوی
(ریڈر شعبۂ عربی۔ الہ آباد یونیورسٹی)

اردو شاعری پر
سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک کے اثرات

سیّد احمد شہید بریلوی علیہ الرحمہ کی تحریک سے متعلق ایک اہم ترین نام شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا ہے جن کو سیّد احمد بریلوی کی تبلیغ و دعوت کی زبان اور قلم کہنا چاہیئے۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ رقم طراز ہیں کہ ہم شاہ اسمٰعیلؒ کو عبقات، رسالہ در منصب امامت، اور تقویۃ الایمان کے مصنّف کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ شاہ صاحب ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ شاہ صاحب جس عظیم تہذیب کے فرد تھے اس میں عام طور سے مکمّل شخصیت کے انسان پیدا ہوتے تھے۔ اکثر علماء و فضلاء کئی علوم و فنون کے ماہر تھے۔ اور شاعری تو ذوق عام اور شائستگی کے بنیادی لوازم میں شمار کی جاتی تھی۔

شاہ ولی اللہؒ کا خاندان یوں بھی مجمع الصفات تھا اس خانوادے کی ایک امتیازی خصوصیت ہی یہ تھی کہ اس کے نامور افراد کئی کئی شعبہ ہائے کمال میں فائق و فائز تھے۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدّین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی ان میں سے ہر ایک سپہر علم کا آفتاب تھا۔

یہی امتیاز شاہ اسمٰعیلؒ کو حاصل تھا۔ مجاہد عظیم، محقق، محدّث، فقیہ، واعظ۔ ان سب اوصاف فائقہ کے ساتھ وہ اچھے شاعر بھی تھے۔ آج کے زمانے پر غور کیجیے! بھلا اس میں اس قسم کی کسی جامع شخصیت کی توقع ہو سکتی ہے۔ تعجّب ہے شاہ اسمٰعیلؒ کی شاعری کے بارے میں

سارے تذکرہ نگار خاموش ہیں صرف نواب صدیق حسین کی کتاب اتحاف النبلاء میں شاہ صاحبؒ کی فارسی اور اُردو شاعری کا ذکر ملتا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے بھی اپنی کتاب "جماعت مجاہدین" میں ان کی مثنوی "سلک نور" کا سرسری طور پر تذکرہ کیا ہے۔ البتہ پاکستان کے محمد خالد سیف ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے خاصی جانفشانی کے بعد شاہ صاحبؒ کی اُردو فارسی نظموں کا مجموعہ شائع کیا۔

تمتع زہر گوشۂ یافتم　　زہر خرمنے خوشۂ یافتم

موجود مجموعے میں جو کلام جمع ہوا ہے اس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ مثنوی سلک نور (اُردو) جس کے آخر میں نسخہ قوت ایمان ہے (۲) رسالہ بے نمازاں (۳) مثنوی سلک نور (فارسی) (۴) قصیدہ در مدح سیّد احمد شہیدؒ (۵) قصیدہ در مدح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (۶) آخری اشعار شاہ صاحب کے رسالہ رد الاشراک (تقویۃ الایمان جس کے باب اوّل اور تذکیر الاخوان باب ثانی کا ترجمہ ہے) کے اختتام پر ہیں۔

ان کے اُردو کلام میں مثنوی سلک نور معرکے کی نظم ہے۔ اس کا مضمون دینی اور اصلاحی ہے اور انھیں خیالات کا ترجمان ہے جو سیّد احمد شہیدؒ کی دعوت و تحریک سے مخصوص تھے۔ مثلاً توحید پر زور دیا اور شرک کی سخت مذمت کی ہے۔ شروع میں حمد و نعت ہے اور اس کے فوراً بعد سیّد احمد شہیدؒ کی توصیف و منقبت ہے۔ اس مثنوی میں جو چیز قابل ذکر ہے وہ اوّل تو یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اپنے عقائد کی تشریح اسی علمی انداز میں کرنے کی کوشش کی ہے، جو ان کی نثری کتاب تقویۃ الایمان میں ہے۔ دوسری بات یہ کہ علمی اور نظریاتی مطالب کے لئے انھوں نے جس شعری تخیل سے کام لیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اگر حقیقتاً شعر و شاعری کے کوچے میں داخل ہو جاتے تو بلند پایہ شعراء کی صف میں ممتاز مقام کے مالک ہوتے۔

مثنوی کا آغاز یوں کرتے ہیں:

الٰہی ترا نام کیا خوب ہے　　کہ ہر جان کو وہی مطلوب ہے
زباں کس طرح حمد تیری کرے　　کہ ہے تو تو ادراک ہی سے پرے

ہمیں بس یہی تیرا ادراک ہے — کہ بیشک تو ہر عیب سے پاک ہے
فلک اس کے سجدے میں ہے واژگوں — ملک اس کی تسبیح میں سرنگوں
اسی کی ہیں خدمت میں شمس و قمر — شب و روز حاضر ہیں بستہ کمر
یہ توحید ہے وہ شراب طہور — کہ اک دم میں لائے ہزاروں سرور
ولے جام کو صاف رکھ چرک سے — دل اپنے کو تو پاک رکھ شرک سے
یہاں تک کرو اس کی تم شست شو — کہ ہرگز نہ باقی رہے اس کی بو
کہ جس دل میں کچھ شرک مستور ہے — سو توحید اس سے بہت دور ہے

توحید میں ایمان اور شرک سے احتناب (اور اس میں شرک خفی اور شرک جلی کی تفصیل) کے ساتھ کائنات میں پھیلی ہوئی خدائی صنعتوں کی جزئیات نگاری کے ذریعہ شاعر (مولانا شہیدؒ) نے خدا کی ہستی کے بارے میں جو گہرا تأثر پیش کیا ہے وہ اس کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔

یہ شمس، یہ کواکب، یہ عالم عناصر، یہ جنگل، کوہ، یہ معدن، یہ ابرِ سیاہ، یہ رعد و برق، یہ قوس قزح، یہ شجر و حجر، رنگ برنگ پھول، گل و لالہ و نسترن اور مرغ چمن اور سرو و سمن۔

غرض ذکر میں سب ہیں رطب اللساں — ہر اک مثل طوطی ہے شیریں بیاں

جنگل کے حیوان، ہوا میں اڑنے والے طیور، رینگنے والے کیڑے، پانی میں تیرنے والی مچھلیاں سب اس کے ذکر میں مشغول ہیں، ملاحظہ ہو:

یہ مچھلی ہے رہتی عجب آن میں — کہ سو سو کرے غسل ہر آن میں
سمندر کی تہہ میں ہے وہ مختفی — سدا ذکر کرتی ہے ذکرِ خفی
ولے جتنی اس کی یہ تسبیح ہے — سو سب ایک نکتہ کی تشریح ہے
سو اس ذکر سے ہو کے بے تاب سی — تڑپتی ہے پھر سطح پر آب کی
پھر اَمواج میں دیکھو یوں ڈوب ڈوب — نکالے ہے دل کا بخار اپنے خوب
دکھائے ہے وہ راہ مشتاق کی — سکھائے ہے یہ رسم عشاق کی

یہ تو ہوا حال عام مخلوق کا۔ مگر انسان جو اشرف المخلوقات ہے اس کی عبادت کی اور ہی شان ہے۔ کہتے ہیں:

ہزاروں عبادت کے انواع ہیں — کہ یاد ان کو ان سب کے اوضاع ہیں
رہے اس کی خدمت میں حاضر مدام — نہ دے غیر کو اپنے دل میں مقام
اسی کے کمالات دیکھا کرے — اسی کے اشارات سمجھا کرے
اسی پر بھروسہ کرے سر بہ سر — پھر اوروں سے بیٹھے وہ ہو کر نڈر
غرض غیر سے جس قدر ہووے دور — سو توحید کا اس قدر ہو ظہور

ان اشعار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر آیات اللہ کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی ذات منزّہ کا کس خوبی سے تصوّر دلاتا ہے۔۔۔۔ چنانچہ جو بات محض ذکر ذات سے حاصل نہیں ہو سکتی وہ ذکر صفات کے ذریعہ بکمال خوبی بیان ہو رہی ہے۔

وہ فارسی اشعار جو انھوں نے اپنے مرشد و امام امیر المومنین سیّد احمدؒ بریلوی کی شان میں کہے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں امام وقت کی ذات سے کس قدر عقیدت اور ان کی تحریک سے کس قدر وابستگی تھی۔

ملاحظہ ہو کہتے ہیں:

بیاد تہنیت شجرۂ امامت کن — کہ بعد گم شدنش ہاں چگونہ گشت پدید
ہزار شکر بہ یزدانِ پاک کز فضلش — زنور قدسی غیبش کہ قطرۂ بہ چکید
زفیض او بہ قلوب جمیع اہل یقیں — زدین محض حنیفی بُنے عجب روئید
زچار سو کند آں قطرہ جذب دلہا را — بطرز سنگ کہ معروف شد بہ نام حدید
بداہتہ ہمہ احبار ازیں زمان دانند — کہ زان اوست ازیں عرصہ منصب تجدید
ہمہ کمال تو موروث زاحمدؐ مرسل — کہ عرق پاک تو او صاف پاک از و بکشید
چو نام نامی او بقرعۂ تو رسید — فلک بگفت گرفتی زہے سہام جدید

دریں زمان توئی جانشین پیغمبر
خلیفہ و خلف و وارث و وصی رشید

بقول پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اس وقت دہلی اس تحریک سے مسحور تھی اور ان وہابی مقررین کی خوش گفتاریوں کے آگے بہت سے چراغ مدھم پڑ گئے تھے۔ حکیم مومن خاں مومنؔ جو شاہ

عبدالقادر دہلوی کے شاگرد شاہ عبدالعزیز کی مجالس وعظ کے حاشیہ نشین مولانا سیّد احمد بریلوی کے مرید اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے ہم عصر تھے، ان کے یہاں بھی اس تحریک کے اثرات صاف نمایاں ہیں۔ عجب بات یہ ہے کہ وہ کوچہ رقیب میں سر کے بل جانے کے لیے تیار ہیں اور شب وصل غیر کاٹنے کے لیے آمادہ لیکن جب وہ عام سطح سے بلند ہوتے ہیں تو اتنے کہ غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کو اصل ایمان اور اپنی جان کو اس راہ میں صرف کر دینے کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

خدایا لشکرِ اسلام تک پہنچا کہ آ پہنچا — لبوں پہ دم بنا ہے جوشِ خوں شہادت کا
نہ کر بیگانہ مہرِ امام اقتدا سنّت — کہ انکار آشنائے کفر ہے ان کی امامت کا
امیرِ لشکرِ اسلام کا محکوم ہوں یعنی — ارادہ ہے مرا فوجِ ملائک کی حکومت کا
زمانہ مہدیٔ موعود کا پایا اگر مومنؔ
تو سب سے پہلے تو کہیو سلام پاک حضرت کا

دوسری جگہ کہتے ہیں:

شوقِ بزمِ احمد و شوقِ شہادت ہے مجھے — جلد مومنؔ لے پہنچ اس مہدیٔ دوراں تک

مومنؔ نے سیّد صاحب کی مدح میں دو قصیدے فارسی میں کہے ہیں لیکن چونکہ یہاں صرف اُردو شاعری زیرِ بحث ہے لہٰذا ان فارسی قصائد سے صرف نظر کرتے ہوئے مومنؔ کے وہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن میں انھوں نے سیّد صاحب اور ان کی تحریک کی مدح کی ہے۔

سیّد صاحب کے متعلق ایک قطعہ میں کہتے ہیں:

گلاب ناب سے دھوتا ہوں مغز اندیشہ — کہ فکرِ مدحت سبطِ قسیم کوثر ہے
وہ کون امام، امامِ جہانیاں احمد — کہ محض مقتدیِ سنّتِ پیمبرؐ ہے
زمیں کو مہرِ فلک سے نہ کیوں ہو دعویٰ نو — کہ اس کا سایۂ اقبال سایہ گستر ہے
زبس کہ کام نہیں ہے اسے سوائے جہاد — جو کوئی اس سے مقابل ہے سو وہ کافر ہے
شرف ہے مہر کو اس کے زمانے سے دائم — زبس کہ روز و شب انصاف سے برابر ہے
وہ بادشاہ ملائک سپاہ کوکب دیں — کہ نورِ شمس و قمر جس کے گردِ لشکر ہے

وہ شعلہ خصلت وحسّاد سوز و کفر گداز — کہ جس کا نقش قدم مہر روز محشر ہے
وہ برقِ خرمن ارباب شرک و اہل ضلال — کہ شعلہ خوشۂ حاصل تو دانہ اخگر ہے
وہ قہرمانِ فلک تو من و نجوم چشم — کہ ترک چرخ غلام اس کا مہر چاکر ہے
وہ شاہ مملکت ایماں کہ جس کا سال خروج — امام برحق مہدی نشاں علی فر ہے

جہادیہ مثنوی: حکیم مومن خاں مومنؔ نے اسی تحریک سے متاثر ہو کر جہاد پر ایک مثنوی بھی لکھی ہے جس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال — کہ گردن کشوں کو کروں پائمال
بہت کوشش و جاں نثاری کروں — کہ شرع پیمبرؐ کو جاری کروں
دکھا دوں میں انجام الحاد کا — نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا
نہ کیونکر ہوں اس کام میں ناشکیب — ظہورِ امام زماں ہے قریب
وہ خضرِ طریقِ رسولِ خدا — کہ سائے سے جس کے خجل مہر و مہ
زہے سیّد احمد قبول خدا — سرامتحانِ رسولِ خدا
نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف — علیؓ و حسینؓ و حسنؓ کا خلف
رہے حشر تک زندہ وہ نیک ذات — ہے کفّار کی موت اس کی حیات
خدا نے مجاہد بنایا اسے — سر قتل کفّار آیا اسے
دم اس دست و بازو پہ دیوے اجل — لب تیغ کے بوسے لیوے اجل

اجل میں ہمیشہ دواں ہو ظفر
رکاب اس کی پکڑے رواں ہو ظفر

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب — یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار — پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے — عروج شہید اور صدیق دے
کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے — ملا دے امام زماں سے مجھے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں — مری جاں فدا ہو تری راہ میں

میں گنجِ شہداں میں مسرور ہوں
اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ مرزا غالب کو بھی حسرت رہی کہ وہابیوں کے دوش بدوش لڑ سکتے لیکن جس طرح ان کی مثنوی امتناع نظیر خاتم النبیین محض ایک ادبی لطیفہ ہے، ویسے ہی یہ آرزو بھی شاعرانہ اسلوب سے زیادہ نہیں۔

اسی ضمن میں سید عبدالرزاق حسنی و حسینی متخلص بہ کلامی کے بھی کچھ اشعار نقل کیے جاتے ہیں جو اصلاً رائے بریلی کے باشندے تھے اور ٹونک میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ انھوں نے صمصام الاسلام یا مجاہدات الاخیار کے نام سے فتوح الشام کو نظم کیا تھا۔ اس میں حمد و نعت، مناقب اصحاب و اہل بیت و مناقب سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے بعد حضرت شمس العارفین امام الزاہدین مجدد مائۃ ثالث عشر سیدنا و مولانا سید احمد غازی و شہید کے مناقب یوں لکھتے ہیں:

قلم کو ہیں میرے ہزار افتخار — کہ لکھتا ہے وصف شہ نامدار
شہ اصفیا سید احمد بنام — سپہر ہدایت کے ماہِ تمام
وہ تھے نور چشم امام الرسل — وہ تھے عاشق خالق جز و کل
نہیں ہند میں کوئی شہر و دیار — کہ مخلص نہ ہوں ان کے واں بیشمار
عنایت سے جس پر نظر ڈال دی — وہیں ہوگیا بس وہ کامل ولی
وہ اُمّی تھے ایسے کہ عالم بڑے — ہوئے مستفیض اور خادم رہے
فنا عشق مولا میں وہ ہوگئے — ہیں دونوں جہاں ان کے قدموں تلے
خوشی سے وہ جام شہادت چڑھا — ہوئے واصل حضرت کبریا

ہمیشہ ہو ان پر خدا کا کرم
وہ تھے ہادی و رہنمائے اُمم

حاصل بحث یہ کہ سید احمد شہیدؒ کی تحریک اس قدر پرکشش اور ہمہ گیر تھی کہ اس سے ان کے عہد کے متعدد اصلاح پسند شعراء متاثر ہوئے اور انھوں نے کھل کر اپنے جذبات

کا اظہار اشعار میں کیا جیسا کہ مذکورہ اشعار سے واضح ہوتا ہے اور یہ تو صرف ان شعراء کا ذکر ہے جن کا اس قسم کا کلام ہم تک پہنچا ہے ورنہ اس عہد کے نہ جانے کتنے معروف اور غیر معروف شعراء ہوں گے جو اس تحریک سے متأثر رہے ہوں گے اور انھوں نے اس تحریک کی تائید و توصیف میں اشعار بھی کہے ہوں گے لیکن دست برد زمانہ سے ان کا کلام ہم تک نہ پہنچ سکا۔ اس کے علاوہ اس عہد کے بعد میں آنے والے اصلاح پسند شعراء کے کلام میں بھی ہمیں اسی تحریک کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مسدس حالی اور اسی قبیل کی دوسری اصلاحی نظموں میں اسی تحریک کا پرتو نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر مسدس حالی کے دو چار بند جن میں اس تحریک کے اثرات بالکل نمایاں ہیں پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہوں:

کرے غیر بُت کی پوجا تو کافر — جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر — کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں — اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں — شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

وہ دیں جس سے توحید پھیلی جہاں میں — ہوا جلوہ گر حق زمین و زماں میں
رہا شرک باقی نہ وہم گماں میں — وہ بدلا گیا آکے ہندوستاں میں
ہمیشہ سے اسلام تھا جس پہ نازاں
وہ دولت بھی کھو بیٹھے آخر مسلماں

ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی

اُردو زبان وادب پر تحریک سیّد احمد شہیدؒ کے اثرات

حضرت سیّد صاحبؒ اور ان کی تحریک تو اللہ کی رضا کے لیے تھی اور بے شک اللہ ان سے راضی ہوگیا، ان کی تحریک کی غرض انسانوں کو اور خاص طور سے مسلمانوں کو اللہ کے لیے جینا اور اللہ کے لیے مرنا سکھانے کے لیے تھی اور الحمد للہ بے شمار انسانوں نے یہ سبق سیکھ لیا، ان کی تحریک کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور احیائے سنّت تھا اور الحمد للہ یہ مقصد بھی خوب پورا ہوا، رہا حضرت صاحب کی تحریک کا اثر اُردو زبان وادب پر تو یہ ضمناً ایک لازمی بات تھی، اس لیے کہ جو معاشرہ جس تحریک سے متأثر ہوگا اس کی زبان اور اس کا ادب بھی لازمی طور پر متأثر ہوں گے، اُردو زبان اگرچہ غیر منقسم ہندیوں کی ہے، جس میں مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی، لیکن جن لوگوں کی اُردو زبان اُردو تھی اور ہے، ان میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور ہے، اور چونکہ مسلم معاشرہ حضرت سیّد صاحبؒ کی تحریک سے بہت زیادہ متأثر ہوا، اس لیے اس کا اثر اس کے زبان وادب پر بھی بھرپور پڑا، اور اُردو زبان خیالی رزم سے نکل کر عملی حقیقی رزم سے آشنا ہوئی، یہاں تک کہ مومن جیسا رنگین مزاج اور عشق شعار یہ کہنے پر مجبور ہوا:

مومن تمہیں کچھ بھی ہے جو پاسِ ایماں ہے معرکۂ جہاد چل دیجیے وہاں
انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز وہ جان جسے کرتے تھے بتوں پہ قرباں

یہی نہیں مسلمانوں میں جوشِ جہاد پیدا کرنے کے لئے ایک "مثنوی جہادیہ" کہہ ڈالی۔ ملاحظہ ہوں بعض اشعار:

پلا مجھ کو ساقی شرابِ طہور کہ اعضاء شکن ہے خمارِ فجور

کوئی جرعہ دے دیں فرزا جام کا — کہ آجائے بس نشہ اسلام کا
بہت کوشش وجاں نثاری کروں — کہ شرعِ پیمبر کو جاری کروں
دکھادوں بس انجام الحاد کا — نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا
نہ کیوں کر ہوں اس کام میں ناشکیب — ظہور امام زماں ہے قریب
زہے سیّد احمدؒ قبول خدا — سرامتحان رسولِ خدا
نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف — علیؓ و حسینؓ و حسنؓ کا خلف
جلو میں ہمیشہ دواں ہو ظفر — رکاب اس کی پکڑے رواں ہو ظفر
ہوا مجتمع لشکر اسلام کا — اگر ہو سکے وقت ہے کام کا
ضرور ایسے مجمع میں ہونا شریک — کہ خوش تم سے ہو وحدہٗ لاشریک
امامِ زمانہ کی یاری کرو — خدا کے لیے جاں نثاری کرو
عجب وقت ہے یہ جو ہمّت کرو — حیاتِ ابد ہے جو اس دم مرو
جو ہے عمر باقی تو غازی ہو تم — سزاوار گردن فرازی ہو تم
الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب — یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
میں گنج شہیداں میں مسرور ہوں — اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

اور صرف حضرت مومن ہی نہیں دوسرے شعراء کے یہاں بھی زوردار آمد شروع ہوئی، مولانا خرّم علی بلہوری مومنین کو یوں ترغیب جہاد دے رہے ہیں:

بعد تحمید خدا نعت رسول اکرم — یہ رسالہ ہے جہاد یہ کہ لکھتا ہے قلم
واسطے دین کے لڑنا نہ پے طمع بلاد — اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
جو رہ حق میں ہوئے ٹکڑے نہیں مرتے ہیں — بلکہ وہ جیتے ہیں جنّت میں مزے کرتے ہیں
اے مسلمانو! سُنی تم نے جو خوبیٔ جہاد — چلو اب اس کی طرف مت کرو گھر بار یاد
مال و اولاد کی جورو کی محبّت چھوڑو — رہِ مولیٰ میں خوشی ہو کے شتابی دوڑو
مال و اولاد تری قبر میں جانے کے نہیں — تجھ کو دوزخ کی مصیبت سے بچانے کی نہیں
کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹخاؤ گے — اپنی سُستی کا جز افسوس نہ پھل پاؤ گے

اب تو غیرت کرو نامردی کو چھوڑو یارو — سیّد احمدؒ سے ملو جلدی سے کافر مارو
تھے مسلمان پریشان بغیر از سردار — ہوا سردار ہے آلِ رسولِ مختار
حضرتِ مولوی اب طاق میں رکھدیجے کتاب — لیجے تلوار اور میدان کو چلدیجے شتاب
وقتِ جانبازی ہے تقریروں کی اب مت چھانٹو — غیر شمشیر کسی سمت کو دل مت بانٹو
اے گروہِ فقراء نفس کشی کے استاد — عمل نفس کشی کون ہے بہتر زجہاد
مت گھسو کونے میں اے پیرجی مانند چچا — چھوڑو اب چلّہ کشی وقت جہاد آپہنچا
اے جوانانِ اسد حملہ ورستم قوّت — کام کس دن کو پھر آوے گی تمہاری جرأت
سر پٹک پیر رگڑ گھر میں کا مرنا بہتر — یارہ حق میں فدا جان کا کرنا بہتر
گر رہِ حق میں نہ دی جان تو پچھتاؤ گے — اور پیمبر کو یہ منہ کیا بھلا دکھلاؤ گے

اور حضرت سیّد عبدالرزّاق حسنی وحسینی کلامی سیّد صاحب اور ان کی تحریک سے متاثر ہو کر یوں رقم طراز ہیں۔

وہ تھے اہلِ حق اور فنا فی الرّسول — گریزاں تھے ان سے ظلوم وجہول
نہ تھی خادموں کو کچھ ان کے ہوس — رضائے الٰہی کے خواہاں تھے بس
فنا عشق مولا میں وہ ہو گئے — ہیں دونوں جہاں ان کے قدموں تلے
خوشی سے وہ جامِ شہادت چڑھا — ہوئے واصلِ حضرتِ کبریا
ہمیشہ ہو اُن پر خدا کا کرم — وہ تھے ہادی [illegible]ئے اُمم

حضرت سیّد احمدؒ کی تحریک سے پہلے کے اُردو کے دینی لٹریچر [illegible] نظر کریں تو انگلیوں پر گن لیں، لیکن آج اُردو زبان میں دینی لٹریچر کا احاطہ ایک بھاری بھرکم کام ہے، کاش کہ کوئی اسکالر تاریخ التراث العربی کی طرح تاریخ تراث اُردو کی ترتیب کا بیڑا اٹھاتا، تو بڑا کام ہوتا، ہمارے ملک میں حضرت صاحبؒ کی تحریک سے پہلے صحیح دین عربی اور فارسی کتابوں میں محفوظ تھا، عوام تو بدعات اور خرافات ہی کو دین جانتے تھے، حج جیسے رکن اسلام کے ساقط ہونے کے فیصلے ہو چکے تھے، دین دار گھرانوں میں بھی سنّت سلام کی جگہ کورنش اور آداب نے لی تھی، حضرت صاحب کی تحریک نے ایک انقلاب برپا کر دیا، تقویۃ الایمان، نصیحۃ المسلمین جیسی کتابیں مسلمانوں کے

مطالعہ میں آئیں، احیاء سنّت کی ایک فضا بن گئی، اُردو مصنّفین دین کے تمام شعبوں پر مستند کتابیں لکھنے پر متوجہ ہوئے اور آج ترجمہ قرآن مجید، تفسیر، حدیث، فقہ تاریخ سب کچھ مفہوم اُردو میں موجود ہے، اور میں تو کہتا ہوں کہ:

دارالعلوم دیوبند کا قیام، ندوہ تحریک اور اس کے دارالعلوم کا قیام، علی گڑھ تحریک، جماعت تبلیغ اور جماعت اسلامی سب کا تعلق حضرت سید احمد شہیدؒ صاحب کی تحریک سے ہے کسی کا بالواسطہ اور کسی کا بلاواسطہ، کسی نے ان کا مقصد بھی اپنایا اور منہج بھی اور کسی نے کسی دوسرے مقصد کے لئے ان کا منہج واسلوب اپنایا، اور ان سب کے ذریعہ جو اُردو لٹریچر وجود میں آیا وہ کمیت میں رشک جمال، اور کیفیت میں بے مثال، دلکش اور انقلاب انگیز، اور بقول شخصے الف لیلۃ ولیلۃ کے مترجموں، محیر العقول مختصر وطویل ترقصہ نویسوں، ناول نگاروں، گل وبلبل اور مشط وآئینہ میں خیال آفرینی اور جدّت طرازی کے موجدوں، صنائع وبدائع سے کھیلنے والوں نے جو ادب پیش کیا وہ صرف ذہنی تعیش اور دل فریبی کے لیے تھا جس سے قوت عمل معطل ہو جائے، لیکن حضرت سید صاحبؒ کی تحریک کے اثرات جس ادب کو جنم دیا وہ زندہ ہے اور زندگی بخش ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ حضرت سیّد صاحبؒ کی تحریک کے بعض مخالفین بھی میدان میں آئے اور اُردو لٹریچر میں انھوں نے بھی کسی قدر اضافہ کیا اور اپنے مقدر کو پایا۔

خود حضرت سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کے حالات پر اُردو میں جو مستقل کتابیں ہیں یا جن کتابوں میں ان کا یا ان کی تحریک کا ذکر ہے وہ خود بڑی تعداد میں ہیں مثال کے طور پر:

سیرت سیّد احمد شہیدؒ	از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
" " "	از مولانا غلام رسول مہر
جماعت مجاہدین	" " "
سرگذشت مجاہدین	" "
جب ایمان کی بہار آئی	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
کاروان ایمان وعزیمت	" " "

تاریخ دعوت وعزیمت	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
وقائع احمدی	مولانا محمد جعفر تھانیسری
سوانح احمدی	" " "
انوار احمدی	" " "
تواریخ عجیب	" " "
منظورۃ السعداء	" " "
امیر الروایات (ارواح ثلاثہ)	حضرت تھانویؒ
احسن الوصایا	نواب وزیر الدولہ
دافع الفساد	مرتضیٰ خاں
تذکرۃ الابرار	مولانا عبدالحی صاحبؒ
ارمغان احباب	" " "
حیاتِ طیبہ	مرزا حیرت بیگ
تذکرہ صادقہ	مولانا عبدالرحیم صادق پوری
ذخیرہ اُمّت	مولانا کرامت علی صاحب
نورٌ علیٰ نور	" " "
مکاشفات کرامت	" " "

رسائل تسع، رسالہ نصائح، صیانۃ الناس، گلشن محمودی، ہلہمات احمد، مخزن احمدی، وصایا الوزیر، تذکرۃ الرشید اور ان کے سوا کتنی کتابیں۔

اختصار کے پیش نظر نثری نمونوں کا انتخاب نہیں پیش کیا گیا ورنہ حق یہ ہے کہ ان کتابوں میں سے بعض تو اردو ادب عالیہ کی شہ پارہ، وشاہکار مانی جاسکتی ہیں۔

حضرت سیّد صاحب کی تحریک کا اثر اردو صحافت پر خاصا پڑا۔ مثال کے طور پر امرتسر سے نکلنے والا رسالہ رسالۃ التوحید دیکھا جاسکتا ہے جس میں "تیرہویں صدی کا مجدد اعظم" کے عنوان سے ایک وقیع مضمون شائع ہوا، تحقیق کی جائے تو متعدد رسالوں، مجلّوں ہفت روزہ

اخباروں میں حضرت سید صاحبؒ کی تحریک سے متعلق اچھا خاصا مواد ملے گا، امید ہے کہ کسی اسکالر کی توجہ اس طرف بھی جائے گی۔ حضرت صاحبؒ کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء کی تالیفات کا مکمل جائزہ لیا جائے تو اور بہت سی ایسی اردو کتابیں سامنے آئیں گی جو حضرت صاحب کی تحریک کا براہ راست عکس لیے ہوں گی۔

بعض شعراء اور ادباء حضرت سید صاحب کی تحریک سے ایسے متاثر ہوئے کہ ان کی تالیفات و تصنیفات اور کلام خالص اسلامی ادب کے نمونے بن گئے، ایسے ادباء و شعراء کی ایک فہرست ہے اس سلسلہ میں ان ہی خاندان کے بعض شعراء و مؤلفین کے نام لیے جاسکتے ہیں، جیسے حضرت کلامی، خیر النساء بہتر، امۃ اللہ تسنیم اور مولانا محمد ثانی رحمۃ اللہ علیہم، آپ ان حضرات کی تصنیفات میں ایک نقطہ بھی اسلام سے الگ نہ پائیں گے، اور ان کا کام وقیع اور معیاری ہے خاص طور سے مولانا محمد ثانی صاحبؒ، جنھوں نے خوب کہا مگر تخلص تک نہ استعمال کیا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی جملہ تصانیف جو بذات خود ایک کتب خانہ ہیں اور اردو ادب میں اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ ان سب پر حضرت سید صاحب کی تحریک کی مکمل چھاپ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب میں حضرت صاحبؒ جیسی مجاہدانہ اسپرٹ پیدا فرمائے اور ہم سے بھی ملت کی خدمت لے کر اپنی رضا کے انعام سے نوازے۔ آمین

فرید احمد اعظمی فلاحی ندوی
شعبۂ معاشیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اُردو نثر نگاری اور سیّد احمد شہیدؒ کی تحریکِ جہاد

حضرت سید احمد شہیدؒ جہاں اپنی اصلاحی اور تجدیدی تحریکوں کی وجہ سے مذہبی اور تاریخی حیثیتوں سے ماضی میں مرکزِ توجہ رہے ہیں وہیں انھوں نے اردو زبان و ادب کو جدید انداز تحریر و اسلوب سے نواز کر اردو زبان و ادب میں اپنی اہمیت کی طرف تاریخ نگاروں کو متوجہ کیا ہے۔

بلاشبہ ماضی میں سید احمد شہید پر جو کام ہوا ہے وہ محتاج بیان نہیں، ہاں البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان و ادب کو جو تاریخ نگار ملے ان کا زاویۂ فکر و نگاہ اردو ادب کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی تنگ رہا ہے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں کی خدمات اردو ادب و زبان کے میدان میں کافی ہیں مگر ان کا جُرم صرف یہ رہا ہے کہ وہ عالم، صوفی اور مصلح کی حیثیت سے متعارف رہے ہیں، ان کو اکثر نظر انداز کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان کی اردو ادب و زبان کی خدمات پر آج تک پردہ پڑا ہوا ہے۔

ظاہر ہے ادب کا دائرہ حسن و عشق تک محدود رکھنا اصولی طور سے غلط ہے اس لئے کہ زبان کو مختلف علوم و فنون سے آشنا کوئی ادیب و شاعر نہیں کرتا ہے بلکہ ان علوم کے ماہرین کرتے ہیں۔ ہاں زبان کو سنوارتا، نکھارتا اور اس کی حفاظت ضرور کرتا ہے اور اس کی ترقی میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

لہٰذا جہاں ادباء، شعراء کا زبان و ادب کی ترویج میں ایک حصہ ہوتا ہے وہیں زبان و ادب کو ترقی دینے میں ایک فلسفی، حکیم اور صوفی کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔" یہی وجہ ہے کہ

زبان کو وسعت صوفیاء کے حلقوں اور حکماء کی مجالس اور محفلوں میں نصیب ہوئی"[1]

اس میں شبہ نہیں کہ اردو ادب پر وہابی تحریک کے اثرات پڑے ہیں لیکن اس کی طرف خاص توجہ نہ دی گئی اور خاص طور سے سید احمد شہیدؒ (متوفی ۱۸۳۱ء) کی تحریک کے اثرات کی طرف، کیوں کہ سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا زمانہ وہابی تحریک کے نقطۂ عروج کا زمانہ ہے۔

یقیناً شاہ ولی اللہؒ نے نظریاتی طور سے تبدیلیاں پیدا کی تھیں اور اس کے بعد شاہ عبدالعزیز نے اس کو عملی رخ دیا۔ لیکن سید شہیدؒ نے ان نظریات کو اور عملی راستوں کو ایک عوامی انقلابی اور جہادی تحریک کی صورت دیا۔ کیوں کہ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مسلمانوں میں شرک و بدعت کا بازار گرم تھا وہ مختلف قسم کے توہمات میں گھرے ہوئے تھے۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے بیان کے مطابق "منوہر ناتھ کے مندر میں ہندو اور مسلمان دونوں سر جھکاتے تھے۔ ستیہ دھرم جو بنگال میں خالص ہندو عقاید کے تحت اٹھارہویں صدی میں وجود پذیر ہوا۔ اس کے ماننے والے ہندو اور مسلمان دونوں تھے"۔[2]

بدعتوں کے علاوہ باہمی تفرقوں کی وجہ سے اسلام کی صورت بالکل مسخ ہو گئی تھی۔ طالب حسین شاہ حسنی کے مطابق ان کے اپنے الفاظ میں "کوئی اللہ غیر اللہ نہیں ہے۔ پس غیر اللہ نہیں ہے تو عین اللہ ہے" یعنی کلمہ کا تصور ہندوانہ ہے اور اس کا مطلب لاموجود الا اللہ نہ کہ لامعبود الا اللہ"۔

ایک طرف تو یہ شرک و بدعت کا گرم بازار، دوسری طرف انگریز اپنی حکومت کو وسیع سے وسیع تر کرتے جا رہے تھے۔ ان تمام حالات میں سید احمد شہیدؒ جیسے نبض شناس نے اسلام کی ناؤ کو خطرے میں دیکھ کر اپنا عین فرض سمجھا کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر خطرہ مول لیا جائے۔ چنانچہ ان تمام لوگوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا جو ان کے خیال میں طریقِ محمدی سے ہٹے ہوئے تھے اور اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے میں رکاوٹ بن رہے تھے، خواہ وہ انگریز

---

[1] "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ"۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق

[2] "وہابی تحریک کا اثر اردو ادب پر"۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، ص ۱۵

ہو یا سکھ یا مسلمان! چنانچہ سید احمد شہیدؒ نے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کو اپنی دعوت و جہاد کا مرکز بنایا۔

دراصل ان کے ذہن میں اس تحریک کے ذریعہ جہاں شرک و بدعت کا خاتمہ کرنا اور کتاب و سنت کی بنیاد پر حکومت شرعیہ قائم کرنا تھا وہیں انگریزوں کو ملک سے بے دخل کرنا بھی تھا چنانچہ انھوں نے شرک و بدعت کو مٹانے کے لئے زبردست تحریک چلائی جس میں سیف و قلم دونوں کا حسب ضرورت استعمال کر کے مسلمانوں میں ایمان و یقین، جذبۂ اسلامی اور جہاد فی سبیل اللہ کی روح پھونک دی اور مجاہدین و دعاۃ کی ایک بہت بڑی جماعت تیار کی جنھوں نے صوبہ سرحد پشاور اور اس کے اطراف میں عملی طور پر ایک اسلامی حکومت قائم کی جس میں حدود شرعیہ کا اجراء اور اسلام کا مالی اور دیوانی نظام عمل میں لایا گیا۔

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا کہ سید احمد شہیدؒ نے جہاں مقاصد کے حصول کے لئے تلوار کا استعمال کیا وہیں پر انھیں مقاصد کے لئے اردو ادب و زبان کو اپنی زبان و قلم کے ذریعہ ایسے وقت میں استعمال کیا جب کہ اردو زبان کا استعمال عام نہ تھا۔ غدر سے پیشتر فارسی زبان ہی عام طور پر استعمال کی جاتی تھی۔

سید احمد شہیدؒ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے پوری جرأت کے ساتھ اپنی تحریک کو آگے بڑھایا اور غالباً اردو زبان نے اس تحریک کے جو اثرات قبول کئے ہیں ان میں سید احمد شہیدؒ کی جرأت اور بے باکی کا بھی ایک حصہ ہے، جس کے اثرات ہم انکے رفقاء کرام شاہ اسماعیل شہیدؒ، مولانا عبدالحی اور اولاد حسن قنوجی حتیٰ کہ مرزا غالب پر بھی گہرے دیکھتے ہیں، نیز صاف گوئی، سلاست، سادگی میں خرم علی بلہوری، عبدالرزاق، مولانا کرامت علی جونپوری، مولانا ابراہیم آروی اور مومن خاں مومن متاثرین میں صف اول میں ہیں۔

سید احمد شہیدؒ کی اردو تصانیف کا باب اگرچہ کچھ زیادہ وسیع نہیں ہے۔ دو ہی رسالے ان کی یادگار ہیں۔ ایک حقیقۃ الصلوٰۃ، دوسرے ان کی تفسیر سورۂ فاتحہ۔ یہ دونوں رسالے سید احمد شہیدؒ کی زندگی ہی میں ایک ساتھ زیور طبع سے آراستہ ہو چکے تھے۔

مگر حیرت ہے کہ سید احمد شہیدؒ کے سوانح نگاروں نے ان کی اہم تصانیف کا بالکل ذکر ہی نہیں کیا۔ چنانچہ اردو زبان میں سید شہیدؒ کے پہلے تذکرہ نگار سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں سید احمد شہیدؒ کا بڑی عقیدت وجامعیت کے ساتھ ذکر کیا ہے لیکن ان کی تصانیف کا ذکر بالکل نہیں کیا، اور نہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے سیرت "سید احمد شہید" میں اس کے بارے میں ذکر کیا، جب کہ صاحب مخزن احمدی مولوی سید محمد علی بن عبدالسبحان رائے بریلوی (م ۱۸۵۰ء) نے اپنی اس تصنیف میں جو کہ سید احمد شہیدؒ کی سوانح عمری میں خود سوانح نگاروں کے بقول، بنیادی حیثیت رکھتی ہے، صفحہ ۳۴ اور ۳۵ کے درمیان دو مرتبہ رسالہ 'حقیقۃ الصلوٰۃ' کا ذکر کیا ہے۔

بلاشبہ سید احمد شہیدؒ کی اردو تصانیف میں حقیقۃ الصلوٰۃ سب سے پہلی اور آخری تصنیف ہی نہیں بلکہ اردو زبان میں اپنے طرز کی ممتاز کتاب ہے۔ یہ اپنے موضوع پر وہ تاریخی اور انقلاب آفریں تقریر ہے جو موصوف نے مولانا عبدالحی (م ۱۸۲۸ء) اور مولانا اسماعیل شہید جیسے عبقریوں کے سامنے بیعت سے قبل کی تھی۔

یوں تو حقیقت الصلوٰۃ کے موضوع پر بہت سی کتابیں ہیں مثلاً حجۃ الاسلام ابوحامد غزالی (م ۵۰۵ھ) نے "احیاء علوم الدین" میں، شاہ ولی اللہ دہلوی نے "حجۃ اللہ البالغۃ" میں، اور ان کے شاگرد علامہ مرتضیٰ بلگرامی نے اتحاف السادۃ المتقین بشرح احیاء علوم الدین جلد سوم میں، اور خواجہ میر درد نے رسالہ اسرار الصلوٰۃ میں بڑے ہی عالمانہ انداز میں نہایت دقیق نکات واسرار کی طرف نشان دہی کی ہے۔ لیکن سید احمد شہیدؒ کی اس موضوع پر تقریر مذکورہ کتابوں سے مختلف اور جداہی نہیں بلکہ سادہ، سہل اور آسان بھی ہے جسے عالم وجاہل دونوں سمجھ سکیں۔ اس ممتاز تصنیف سے موصوف کی دقت نظر، طرز فکر اور مسائل کی فکر اور روح شریعت تک رسائی پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز قدرت بیان کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ پس کتاب کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں:

"بڑی بندگی نماز ہے کہ بدون اس کے کوئی بندگی قبول نہیں، کیوں کہ سرا سب بندگیوں اور برے کاموں سے بچنے کا یہی ہے اور اس نماز سے کوئی غافل

نہیں، نہ درخت نہ عمارات، نہ پرند نہ حیوانات نہ حشرات، نہ زمین، نہ پہاڑ، نہ ستارہ نہ آسمان، نہ ارواح، نہ فرشتے جیسے کہ نماز درخت و عمارات کی قیام ہے اور پرند اور حیوانات کی رکوع، اور تمام حشرات کی سجود اور زمین پہاڑ کی قعود اور ستاروں اور آسمان کی حرکت اور ارواح اور فرشتوں کی طہارت اور تسبیح اور کلمۂ شہادت اور تلاوت قرآن اور ذکر و دعا۔"[1]

اور یہی انداز تحریر سید احمد شہیدؒ نے اپنی تفسیر سورۂ فاتحہ میں بھی اپنایا ہے، مثلاً تفسیر کا آغاز بسم اللہ کے تحت یوں کیا ہے:

"اس سورہ میں اللہ نے دعا کی طرح بتلائی اور اللہ کے بتلائے برابر کسی کا بتلایا نہیں ہوتا اس واسطے یہ سورہ بڑی بزرگی رکھتی ہے، اور دعا میں دستور یوں ہے۔ ہر کوئی جانے ہے کہ باوجودیکہ سب آدمی محتاج معذور ہیں۔ یہ سوال کرنے میں جو آدمی سخی کریم باہمت اور بامقدور ہوتا ہے اس سے مانگتے ہیں۔ جتنا تفاوت آدمیوں میں اوصاف سے ہوتا ہے اتنا ہی سوال کرنے میں فرق پڑتا ہے جس میں سخاوت نہ ہو اس سے نہیں مانگتے اور جو سخاوت ہو پر ترشروئی ہو تو اس سے بھی مانگنے میں پرہیز کرتے ہیں اور جو ترشرو بھی نہ ہو بہت خلق ہو ہر دینے کے پیچھے اترو ائے۔ جتلاوے منت رکھے اس سے بھی مانگنا اچھے آدمیوں کو سخت بھاری ہوتا ہے اور جو بے مقدور ہو تو اس سے مانگنا ہی نہیں ہو سکتا اور جتنے یہ اوصاف کمال پر ہوں اتنا مانگنا اس سے خوب ہوتا ہے یہاں تک کہ مانگنا عزت ہو جاتا ہے۔"[2]

اوپر کی تحریروں میں ہم نے مشاہدہ کیا کہ سید احمد شہیدؒ نے بالکل بول چال کی زبان استعمال کی ہے اور روزمرہ استعمال ہونے والی زبان تک کو نہیں چھوڑا ہے،

---

[1] حقیقۃ الصلوٰۃ ـــ سید احمد شہیدؒ

[2] تفسیر سورۂ فاتحہ ـــ سید احمد شہیدؒ

تصنّع اور لفاظی سے بالکل دور ہیں۔ ہندی کے بھی مستعمل الفاظ کے استعمال میں نہیں ہچکتے جو کہ اس دَور کے لئے بالکل عام فہم تھے اس طرح دونوں تصنیفوں کی تحریر کو پڑھنے کے بعد یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ عام طور سے گفتگو کی زبان ہے یا تقریر کی یا تصنیف و تفسیر کی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی باتوں کو عوام کو سمجھانے کے لئے عام فہم، سلیس اور ٹھیٹھ اردو کے مختصر رسالے لکھنے کی داغ بیل سب سے پہلے سید احمد شہیدؒ ہی نے ڈالی جس کے اثرات ان کے خلفاء اور مریدین کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔

سید احمد شہیدؒ نے تفسیر کو موضح القرآن کی طرح ریختہ کے بجائے ہندی یعنی مروجہ ہندوستانی میں لکھی ہے تاکہ ہر خاص و عام بآسانی سمجھ سکے۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس سے زیادہ عرصہ اس تفسیر پر گذر چکا، اس کی زبان اگرچہ پُرانی ہو چکی تاہم آج بھی اس کا اندازِ بیان دلنشیں محسوس ہوتا ہے۔

جہاں تک سید احمد شہیدؒ کی تحریر کے اثرات کا تعلق ہے، تو شاہ اسمٰعیل شہیدؒ سے زیادہ کسی کی تحریر میں نہیں نظر آتے۔ چونکہ دونوں نے آثار الصنادید میں سر سید احمد خاں کے بیان کے مطابق شاہ عبدالقادرؒ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اور یوں بھی دونوں کی طویل رفاقت رہی ہے، اسی لئے سید اسماعیل شہیدؒ کو سید احمد شہید کی طرح روزمرہ، سادہ، سلیس اور عام فہم زبان کے استعمال میں خاص امتیاز حاصل ہے اور یہ قدرت بیان اور امتیاز موصوف کی اہم ترین کتاب 'تقویۃ الایمان' میں ان کی دیگر کتابوں مثلاً تذکرۃ الاخوان، صراط مستقیم اور عبقات سے زیادہ واضح نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس کتاب کو اپنی لسانی خصوصیات کی بنا پر اردو زبان کی ابتدائی تالیفات میں جو مقام حاصل ہے۔ اس کا ذکر اردو کے سبھی تاریخ نگاروں نے کیا ہے۔ اس میں سید احمد شہیدؒ کی تمام وہ تحریری خصوصیات جھلکتی ہیں جس کی بنا پر وہ اپنے معاصرین میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، چنانچہ ان کی تصنیفات 'حقیقۃ الصلوٰۃ' اور 'تفسیر سورۂ فاتحہ' کی تحریروں اور شاہ اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ کی 'تقویۃ الایمان' و 'صراط مستقیم' کی تحریروں میں زیادہ حد تک مشابہت ہے، اور

افکار تو سید احمد شہیدؒ کے ہیں ہی۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنی کتاب 'تقویۃ الایمان' کو دو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب توحید و شرک کے بیان میں ہے۔ اور دوسرا باب اتباع سنت کی خوبیوں اور بدعت کی برائیوں کے بیان میں ہے۔ چنانچہ پہلے باب میں شرک کی چار قسمیں بتلایا ہے،

۱۔ اشراک فی العلم، ۲۔ اشراک فی التصرف، ۳۔ اشراک فی العبادات، ۴۔ اشراک فی العادات۔

چنانچہ ص ۱۱ پر توحید و شرک کے بیان میں رقم طراز ہیں:

"کہ اول سُننا چاہیئے کہ شرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اہل توحید نایاب لیکن اکثر لوگ شرک و توحید کے معنی نہیں سمجھتے اور ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں، حالانکہ شرک میں گرفتار ہیں۔ سو اول معنی شرک و توحید کے سمجھنا چاہیئے تاکہ برائی بھلائی ان کی قرآن و حدیث سے معلوم ہو۔ سُننا چاہیئے کہ اکثر لوگ پیروں کو اور پیغمبروں کو اور اماموں کو اور شہیدوں کو اور فرشتوں کو اور پریوں کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں اور ان کی منتیں مانتے ہیں۔" [1]

آگے دوسری فصل اشراک فی العلم میں آیت وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو الخ کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

"یعنی جس طرح اللہ صاحب نے بندوں کے واسطے ظاہر کی چیزیں دریافت کرنے کو کچھ راہیں بتادی ہیں جیسے آنکھ دیکھنے کو، کان سُننے کو، زبان چکھنے کو، ہاتھ ٹٹولنے کو، عقل سمجھنے کو اور راہیں ان کے اختیار میں دی ہیں کہ اپنی خواہش کے موافق ان سے کام لیتے ہیں، جیسے جب کچھ دیکھنے کو جی چاہا تو آنکھ کھول دی، نہ چاہا تو آنکھ بند کرلی، جس چیز

---

[1] تقویۃ الایمان ــــ شاہ اسمٰعیل شہید ص ۱۱

کے مزہ دریافت کرنے کا ارادہ ہوا منھ میں ڈال لیا۔ نہ ارادہ ہوا نہ ڈالا۔ سو گویا کہ ان چیزوں کو دریافت کرنے کو کنجیاں ان کو دی ہیں۔ جیسی جس کے ہاتھ میں کنجی ہوتی ہے فعل اسی کے اختیار میں ہوتا ہے۔ جب چاہے تو کھولے جب چاہے نہ کھولے۔ اسی طرح ظاہر کی چیزوں کو دریافت کرنا لوگوں کے اختیار میں ہے۔"[1]

آگے چل کر چھٹی فصل فی ردّ بدعۃ التقلید کے بیان میں رقم طراز ہیں:

"سننا چاہیئے کہ اکثر لوگ مولویوں اور درویشوں کے کلام کی اور کام کو سند پکڑتے ہیں اور ان کے کلام کی پیروی کرتے ہیں۔ اور ان کے حق میں یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو انھوں نے کیا اور کہا وہی ٹھیک ہے اور اللہ کی راہ وہی ہے۔"

کچھ آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

"اور اصل بات یہ ہے کہ حاکم مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس کے حکم کو ماننا چاہیئے اس کے سوا اور کسی کا حکم نہ مانئے اور رسول کا حکم ماننا بھی خدا ہی کا حکم ہے۔ خود پیغمبر بھی حاکم نہیں، پھر اور کوئی مجتہد اور فقیہ اور مولوی مفتی، قاضی مُلّا، طالب علم اور غوث قطب اور ولی اور پیر شہید اور پیرزادے، خادم، مجاور، مرید تو کس گنتی اور شمار میں ہیں۔"[2]

یہی انداز تحریر صراط مستقیم میں لئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ بدعت زیارت قبر کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

"اہل اللہ کی قبروں پر ناجائز بدعتوں کا اظہار صوفی شعار مشرکوں کی ان بدعات سے ہے جو اس ملک کے لوگوں کی نظر میں نیک کام کے لباس میں ظاہر ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ بدعتیں بے شمار ہیں۔ لیکن دو تین قبیح امر مثال کے طور پر اس

---

[1] تقویۃ الایمان ۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ، ص ۲۷، [2] ایضاً ص ۲۱۸

مقام میں ذکر کئے جاتے ہیں تاکہ دوسرے قبیح کاموں کو بھی انھیں امور مذکورہ پر قیاس کر سکیں۔ دور دور ملکوں سے سفر کی بڑی بڑی مصیبتیں اٹھا کر اور رات دن کی تکلیفیں اور دُکھ جھیل کر اولیاء اللہ کی قبروں کی زیارت کے واسطے آنا انھیں بدعات میں سے ہے اور ان سفروں میں اگرچہ یہ تکلیفیں اٹھاتے ہیں اور یہ سفر ان کو شرک کے ظلمات اور اللہ تعالیٰ کے غضب کی وادی میں پہنچاتے ہیں تاہم عوام اس کو سفر حج کے برابر بلکہ بعض وجوہ سے بہتر جانتی ہے"[1]

آگے فی الاعتصام بالسنۃ والاحتساب عن البدعۃ کے باب میں تحریر فرماتے ہیں:

"حق تعالیٰ نے فرمایا یہ قرآن جو میں نے تمھارے واسطے بھیجا، جو رویہ اور طریقہ اس میں تمھارے کرنے کے لئے فرمایا۔ یہی راہ میری رضامندی اور میری طرف پہنچنے کی سیدھی ہے، اس راہ پر چلو اور سوا اس کے اور راہیں باپ دادا کی اور پیر و استاد کی، رسم و رواج ملک کے بادشاہوں کی نہ چلو۔ اگر ان راہوں پر چلو گے تو وہ راہیں تم کو میری راہ سے بہکا دیں گی۔ یہ میں نے تم کو سمجھا دیا کہ تم خبردار ہو جاؤ"[2]

یہاں جب ہم سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریروں پر نظر ڈالتے ہیں تو سید احمد شہیدؒ کی تحریروں کی خصوصیات شاہ اسمٰعیل کی تحریروں میں مکمل طور سے پاتے ہیں، درحقیقت سید احمد شہیدؒ کی تحریروں میں سر سید احمد خاں کی صاف گوئی، سادگی، روانیٔ تحریر اور بے باکی پاتے ہیں، میرے اپنے احساس کے مطابق جس طرح سر سید احمد خاں کو حالات نے یہ انداز تحریر اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ موصوف کی تحریر کی اضطراری کیفیت مولانا حالی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"ان کی حالت اس بے قرار آدمی کی طرح تھی جو گھر میں آگ لگی دیکھ کر بے تابانہ ہمسایوں کو آگ بجھانے کے لئے پکارتا ہے۔" (حیات جاوید)

---

[1] صراط مستقیم۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ، ص ۵۹۔ [2] ایضاً، ص ۷۸

ٹھیک یہی حالت سید احمد شہیدؒ کی تھی، ان کی نگاہ ہر وقت مضمون پر رہتی تھی جس طرح ذہن و دماغ میں آتا اس کو ادا کر دیتے تھے۔ انھیں اس کی فرصت نہ تھی کہ مہینوں بلکہ ہفتوں اور دنوں کا انتظار کریں۔ وہ اپنے احساسات و خیالات کو جلد سے جلد الفاظ میں تبدیل کر دینا چاہتے تھے اسی سے ان کو تسکین حاصل ہوتی تھی باوجودیکہ سید احمد شہیدؒ بڑے فصیح اللسان شخص تھے جس کی شہادت تاریخ ادب اردو کا مرتب رام بابو سکسینہ مندرجہ ذیل الفاظ میں دیتا ہے:

"سید صاحب چونکہ بڑے قابل اور فصیح شخص تھے لہٰذا ان کی تقریریں اور وعظ سُن سُن کر لوگ بکثرت ان کے مرید ہو گئے تھے۔"[1]

یہی تحریری اثرات پورے طور سے ہم شاہ اسماعیل شہید کی تحریروں میں پاتے ہیں خواہ وہ تذکیر الاخوان ہو یا صراط مستقیم، مگر تقویۃ الایمان ان کی تمام تصنیفات میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے جس میں مصنف کے انتقال کے بعد محمد سلطان خاں نے دوسرے حصے کا بھی اضافہ کیا ہے۔ بہر کیف شرک کی مذمت اور تردید میں اپنے اسلوب نیز فکر کے لحاظ سے بے مثال کتاب ہے، جو اپنے اندر سادگی، روزمرہ استعمال ہونے والی زبان، سلاست، عدم تصنع و تکلف کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ نیز عام فہم سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ سید احمد شہید کی بے باکی تحریر کی واضح مثال ہے، جس نے جدید اردو کے لئے زمین ہموار کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ یہ سید احمد شہیدؒ کا سادہ، دلکش، بے باکانہ طرز گفتگو اور تحریر ہی تھا جس نے شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحی ہی کو صرف نہیں متاثر کیا بلکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہوا حلقہ بنا لیا۔ اسی بے باکی سے مرزا غالب نے فن لغت و شعر میں بڑے بڑے اساتذہ پر نکتہ چینی کی اور اس بات پر زور دیا کہ اگلے جو کچھ لکھ گئے وہ وحی اور الہام نہیں ہے اور نہ ہر پرانی لکیر صراط مستقیم ہے۔ اس سے آگے سید شہیدؒ کے اثرات ولایت علی، شاہ رفیع الدین نیز حکیم مومن خاں مومنؔ، خرم علی بلہوری پر نمایاں ہیں۔

---

[1] تاریخ ادب اردو، مترجمہ مرزا محمد عسکری، طبع سوم حصہ نثر باب ۱۵، ص ۳۵

سید احمد شہیدؒ کے اثرات رام بابو سکسینہ کے الفاظ میں "مولوی اسماعیل صاحب کا مشہور رسالہ "تقویۃ الایمان" اور نیز دیگر مریدان مولوی سید احمد کی تصانیف مثلاً ترغیب جہاد، ہدایۃ المومنین، نصیحۃ المومنین (او المسلمین)، موضح الکبائر والبدعات، مأۃ مسائل وغیرہ، ان سب سے اردو زبان کو بھی ضرور تقویت پہونچی اس کے علاوہ ادب اردو کے تاریخ نگار مستشرق گارساں دتاسی کے مطابق وہ اثرات بھی سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے حق ہی میں جائیں گے جس سے مسلمان فرقوں کی تصانیف مثلاً (۱) سید احمدیوں (۲) ہندوستانی وہابیوں اور (۳) روشنائیوں وجود میں آئیں نیز سید احمد شہید کے دوبارہ ظہور پذیر ہونے پر رسالے لکھے گئے۔"

یہ اردو کی تصانیف جن کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے اس نے جہاں مقاصد تحریک کی تبلیغ و اشاعت میں حصہ لیا ہے وہیں پر اردو نثر جو تکلفات سے گراں بار تھی اس کے گردن سے تصنع، تکلف، تسجیع و ابہام کا قلادہ اتار پھینکا اور اس کی جگہ صاف گوئی، جرات، بیباکی، سادگی و سلاست کا ہار پہنایا جس پر سید احمد شہیدؒ کے رفقاء کی نثر نگاری کی بنیاد قائم ہے۔ یہی وہ تحفہ ہے جو ان کتابوں نے اردو ادب کو دے کر جدید اردو کو ایک رُخ دیا اور یہی سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے اردو نثر نگاری پر اہم اور بنیادی اثرات ہیں۔

سیمینار کے موضوع سے متعلق دیگر

مقالات اور نظمیں

مولانا سید سلیمان ندویؒ

تحریک تجدید دین

تیرہویں صدی کا آغاز تھا کہ اس خاندان میں چودہویں کا چاند طلوع ہوا یعنی ۱۲۰۱ھ میں مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش ہوئی، چند سال کے بعد یہ چاند مجاہدہ و عرفان کا آفتاب بن گیا۔

نہ شبم، نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
چو غلامِ آفتابم، ہمہ ز آفتاب گویم!

تیرہویں صدی میں جب ایک طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں مشرکانہ رسوم و بدعات کا زور تھا، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی مجاہدانہ کوششوں نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی، یہ وہ وقت تھا جب سارے پنجاب پر سکھوں کا اور باقی ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا، ان دو بزرگوں نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اٹھایا اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی، جس کی آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائیوں سے لے کر خلیج بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق اس علم کے نیچے جمع ہونے لگے، اس مجددانہ کارنامے کی عام تاریخ لوگوں کو ہمیں تک معلوم ہے کہ ان مجاہدوں نے سرحد پار ہو کر سکھوں سے مقابلہ کیا اور شہید ہو گئے، حالانکہ یہ واقعہ اس کی پوری تاریخ کا صرف ایک باب ہے۔

ان مجاہدوں کی تاریخ بتائے گی کہ ان کی تحریک کا یہ ناکام انجام کیوں ہوا، واقعہ ڈھکا چھپا اور اسباب نامعلوم نہیں، وہی جماعتوں کا نفاق اور امراء کا اختلاف ان کی ناکامی کا سبب ہوا، جو ہمیشہ سے ناکاموں کی ناکامی کا سبب بنتا رہا ہے، پشاور کے پٹھان امراء اگر وفاداری سے کام لیتے تو آج ہندوستان کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔

اس تحریک نے اپنے پیروؤں میں للّٰہیت، خلوص، اتحاد، نظم، سیاست اور تنظیم کا جو جوہر پیدا کر دیا تھا۔" بنگال کی سرحد سے لے کر پنجاب تک اور نیپال کی ترائی سے لے کر دریائے شور کے ساحل تک اسلامی جوش و عمل کا دریا موجیں مار رہا تھا، اور حیرت انگیز وحدت کا سماں آنکھوں کو نظر آرہا تھا۔

سیّد صاحبؒ کے خلفاء ہر صوبے اور ولایت میں پہنچ چکے تھے، اور اپنے اپنے دائرے میں تجدید اصلاح اور تنظیم کا کام انجام دے رہے تھے، مُشرکانہ رسوم مٹائے جا رہے تھے، بدعتیں چھوڑی جا رہی تھیں، نام کے مسلمان کام کے مسلمان بن رہے تھے، جو مسلمان نہ تھے وہ بھی اسلام کا کلمہ پڑھ رہے تھے[1]، شراب کی بوتلیں توڑی جا رہی تھیں، تاڑی اور سیندھی کے خم پھوڑے جا رہے تھے، بازاری فواحش کے بازار سرد ہو رہے تھے، اور حق و صداقت کی بلندی کے لیے علماء حجروں سے اور اُمراء ایوانوں سے نکل نکل کر میدان میں آرہے تھے، اور ہر قسم کی ناچاری، مفلسی اور غربت کے باوجود تمام ملک میں اس تحریک کے سپاہی پھیلے تھے اور مجاہد تبلیغ اور دعوت میں لگے تھے۔

بقیہ صفحہ ۹۴ سے آگے:۔

معروف اہل قلم کی تصنیفات . . . .

جن میں مولانا کی فکر و خیالات کی پوری طرح چھاپ ہے۔ اور اس میں مولانا کی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ جس راہ پر وہ چلتے ہیں تو آگے پیچھے ان کے شاگردوں کا ایک حلقہ بھی رہتا ہے جو اُن کی فکر، ان کے خیال، ان کی زبان اور ان کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے اس طرح اُردو نثر نگاری میں سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک کے اثرات جو ابوالکلام کی تحریروں میں ظاہر ہوئے اور بعد میں مولانا ابوعلی مودودی، مولانا ابوالحسن ندوی اور ان کے شاگردوں کے ذریعہ مسلسل پھیل رہے ہیں۔ ••

---

[1] کہتے ہیں کہ اس تبلیغ سے چالیس ہزار مسلمان ہوئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

فاتح زمانہ

اور پھر چند قدم اور آگے بڑھو۔ مقام عزیمت و دعوت کی کیسی کامل اور آشکارا مثال سامنے آتی ہے۔ ساری مثالوں سے آنکھیں بند کرلو۔ صرف یہی ایک مثال زیر بحث حقیقت کے فہم و کشف کے لیے کافی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام ہر رنگ میں کس درجہ جامع و کامل ہے؟ بااین ہمہ یہاں جو کچھ ہوا، تجدید و تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحاب استعداد تک محدود رہا۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مرد میدان کا منتظر تھا۔ اور معلوم ہے کہ توفیق الٰہی نے یہ معاملہ صرف حضرت علامہ و مجدد شہید رضی اللہ عنہ کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا۔

میخواست دست خیز زعالم براورد
آں باغبان کہ تربیت ایں نہاں کرد

اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو انھیں کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔ حضرت پیر انصاری کا قول یاد رہے "من مرید خرقانی ام لیکن اگر خرقانی دریں وقت می بود، باوجود پیریش مریدی می کردم"، شاہ صاحب نے مزاج وقت کے عدم تحمل و استعداد سے مجبور ہو کر بحکم:

بہ رمز نکتہ ادا می کنم کہ خلوتیان
سر سبو بکشادند و در فرو بستند

دعوت و اصلاح اُمت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوتلہ کے حجروں میں دفن کر دیے تھے، اب اس سلطان وقت و اسکندر عزم کی بدولت شاہجہان آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی

سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ پچ گیا، اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گذر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کو کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی، وہ اب برسرِ بازار کی جا رہی اور ہو رہی تھیں۔ اور خونِ شہادت کے چھینٹے حرف و حکایات کو نقوش و سواد بنا کر صفحۂ عالم پر ثبت کر رہے تھے:

آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم
حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

پھر کیا اس وقت ہندوستان علم و عمل سے خالی ہو گیا تھا؟ یا حق پر چلنے والے اور حق کا درد رکھنے والے معدوم ہو گئے تھے؟ کون ہے جو ایسا کہہ سکتا ہے؟ خود اسی خاندان عالی میں کیسے کیسے اکابر و اساتذۂ علم و عمل موجود تھے؟ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے درس و تدریس کی بادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم و عمل کے آفتاب تھے۔ خاندان سے باہر آ کر ان کے تربیت یافتوں کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں ان کا فیضانِ علم کام نہ کر رہا ہو۔ با ایں ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ جو وقت کا ایک سب سے بڑا کام تھا، اس کے لیے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی۔ سب دوسرے دوسرے کاموں میں رہ گئے۔ یا حجروں کا کام یا مدرسوں کا۔ لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا؟ وہ گویا ایک خاص پہناوا تھا جو صرف ایک ہی جسم کے لیے تھا اور ایک ہی پر چست آیا۔ دنیا اس کے لیے خلعتِ عظمت اور تشریفِ قبول کاندھے پر ڈالے منتظر کھڑی تھی زمانہ اپنے سارے سامانوں کے ساتھ کب سے اس کی راہ تک رہا تھا۔ امیدواروں پر امیدوار یکے بعد دیگرے گذرتے رہے مگر اس کا مستحق کوئی نہ نکلا۔

بارِ غم اور عرضِ بہر کس کہ نمودم
عاجز شد و ایں قرعہ بنام زسرِ اُفتاد

تو یہ وہی حقیقت ہے جو کتنی دیر سے تمہارے ذہن نشین کر رہا ہوں یعنی اس وادی کا مرد کار ہر صاحبِ علم و عمل نہیں ہو سکتا۔

مردِ این رہ را نشانے دیگرست!

استادی و شاگردی، نوعمری و کہولہ، خانقاہوں کی دھوم دھام، اور مدرسوں کا ہنگامہ، یہ ساری

باتیں یہاں کے لیے بیکار ہیں۔ ان سارے عہدوں میں دیکھو۔ باعتبار علم وعمل ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر موجود تھا، اور بقدر طاقت دعوۃ وتذکیر وارشاد خلق میں ساعی۔ تاہم دعوت دوسری چیز ہے۔ اور عزیمت دعوت کا مقام دوسرا ہے۔ اس کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ گڑھیوں کا محاصرہ کر لینا آسان ہے مگر قلعوں اور ملکوں کی تسخیر کی دھن دوسری ہے۔ ایک شخص کتنا ہی بڑا امیر الامراء ہو، لیکن پھر امیر ہے۔ بادشاہوں کا عزم اور محل شاہی میں پلے ہوؤں کا دماغ کہاں لا سکتا ہے؟

نہ ہر کہ طرف کلہ کج نہاں وتند نشست
کلاہ داری وآئین سروری دانہ!

بڑوں بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سروسامان واسباب کار فراہم نہیں۔ لیکن وقت کا عازم وفاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سروسامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کر لوں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیئے اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے۔ اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہو گئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیے۔ اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ؟ درختوں کو دوڑنا چاہیئے۔ اگر دشمن بے شمار ہیں تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں۔ اگر رکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہو گیا کہ راہ صاف نہیں کرتے؟ وہ زمانہ کی مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکری کرائے۔ وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے، اور زمانہ کے حکموں پر نہیں چلتا، بلکہ زمانہ آتا ہے تاکہ اس کی جنبشِ لب کا انتظار کرے۔ وہ دنیا پر اس لیے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھر لوں؟ وہ یہ دیکھنے کے لیے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے جس کو پورا کر دوں۔ اُس کا مایۂ خمیر بخشش ونوال ہے۔ طلب وسوال نہیں اس کی نظریں طاق کی بلندی نہیں ناپتیں۔ ہمیشہ اپنے ہاتھ کی رسائی اور قد کی بلندی دیکھتی رہتی ہیں۔ اس کا فغان عجز ونا امیدی یہ نہیں ہوتا۔

کمند کوتہ، و بازوے سست، بام بلند
بہ من حوالہ، و نومیدیم گنہ گیرند

بلکہ ہمیشہ اس نشید کامرانی ورجزیۂ ملوکی سے غلغلہ انداز عالم وعالمیاں ہوتا ہے۔ کما قال القاضی السعید بن سناء الملک۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

وانك عبدي يا زمان وانني ... على الرغم مني أن أرى لك سيدا
وما أنا راض انني ولطئ الثرى ... ولي همة لا ترتضي الافق مقعدا
ولو علمت زهر النجوم مكانتي ... لحزت جميعاً نحوي وجهي سجدا
ارى الخلق دوني اذا أراني فوقهم ... ذكاء وعلماً واعتلاء وسؤدددا
ويأبي إبائي ان يراني قاعداً ... وإني أرى كل البرية مقعدا
ولو مد نحوي حادث الدهر كفه ... لحديث نفسي ان أمد له يدا

ستاروں سے تمام فضاء سمائی بھری پڑی ہے لیکن دمدار ستارے ہمیشہ طلوع نہیں ہوتے۔ یہی حال اصحاب عزائم کا بھی ہے۔ وہ کائنات ہستی کا ایک بالکل الگ گوشہ ہے اور وہاں کے احکام وقوانین کو دنیا کے اعمال عادیہ پر قیاس کرنا غلطی ہے۔ ان کی قوتیں الٰہی، ان کے وسائل غیر مختم، ان کی ترقیاں لازوال، اور ان کے تمام طریقے غیر مختم ہوتے ہیں۔ اللہ کی حکمت وربوبیت ان کو تمام خلق اللہ میں سے چن لیتی اور بحکم "وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ"، اپنی رحمتوں اور ربوبیتوں کے عجائب وخوارق ان کے لیے مخصوص کر دیتی ہے۔ پھر ان کے معاملات میں نہ تو کسی دوسرے کا ساجھا ہوتا ہے، نہ کسی مدعی کی وہاں تک رسائی۔ اولئك قوم لما دعوا اجيبوا، ولما اجيبوا، لما احبوا خلصوا، ولما اخلصوا استخلصوا، صدقت منهم الضمائر، فصفت منهم السرائر، وصاروا صفوة الله في ارضه، ففاضت عليهم انواره، وامتلاءت قلوبهم من اسراره:

الا ان وادي العزع اضحى ترابه ... من المسك كافورا واعواده رندا
وماذاك الا، ان هذا عشية ... تمشت، وجرت في جوانبه بردا

فلا تجهد نفسك في كشف مراتبهم، وذوق حقائقهم، حتى تتصل منهم بسبب، وتصل من هديهم بطرف، فلسان حالهم ينشدك:

وكم سائل عن سر ليلى رددته ... بعمياء من ليلى بعين يقين
يقولون خبرنا فانت امينهم ... وما انا ان خبرتهم بأمين

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

شہدائے بالاکوٹ کا مقام و پیغام

اس معرکے میں وہ پاک نفوس شہید ہوئے جو عالمِ انسانیت کے لئے رونق و زینت اور مسلمانوں کے لیے شرف و عزت اور خیر و برکت کا باعث تھے۔ مردانگی و جواں مردی، پاکیزگی و پاکبازی، تقدس و تقویٰ، اتباعِ سنت و شریعت اور دینی حمیت و شجاعت کا وہ عطر، جو خدا جانے کتنے باغوں کے پھولوں سے کھینچا گیا تھا اور انسانیت اور اسلام کے باغ جیسا "عطر مجموعہ" صدیوں سے تیار نہیں ہوا تھا اور جو ساری دنیا کو معطر کرنے کے لیے کافی تھا، ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ کو بالاکوٹ کی مٹی میں مل کر رہ گیا۔ مسلمانوں کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔ حکومتِ شرعی ایک عرصہ تک کے لیے خواب بے تعبیر ہو گئی۔ بالاکوٹ کی زمین اس پاک خون سے لالہ زار اور اس گنج شہیداں سے گلزار بنی، جس کے اخلاص و للّٰہیت، جس کی بلند ہمتی و استقامت، جس کی جرأت و ہمت اور جس کے جذبۂ جہاد و شوقِ شہادت کی نظیر پچھلی صدیوں میں ملنی مشکل ہے، بالاکوٹ کی سنگلاخ و ناہموار زمین پر چلنے والے بے خبر مسافر کو کیا خبر کہ یہ سرزمین کن عشاق کا مدفن اور اسلامیت کی کس متاعِ گرانمایہ کا مخزن ہے۔

یہ بلبلوں کا، صبا، مشہدِ مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو، یہ تیرا باغ نہیں

اللہ کے کچھ مخلص بندوں نے ایک مخلص بندے کے ہاتھ پر اپنے مالک سے اس کی رضا، اُس کے نام کی بلندی اور اس کے دین کی فتح مندی کے لیے آخری سانس تک کوشش کرنے اس راہ میں اپنا سب کچھ مٹا دینے کا عہد کیا تھا۔ جب تک ان کے دم میں دم رہا، اسی راہ میں

سرگرم رہے۔ بالآخر اپنے خونِ شہادت سے اس پیمانِ وفا پر آخری مہر لگادی۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ۲۴ر ذوالقعدہ کا دن گذر کر جو رات آئی، وہ پہلی رات تھی، جس رات کو وہ سُبکدوش و سُبک سر ہو کر میٹھی نیند سوئے۔

وہ خلعت شہادت پہن کر جس کریم کی بارگاہ میں پہنچے، وہاں نہ مقاصد کی کامیابی کا سوال ہے، نہ کوششوں کے نتائج کا مطالبہ، نہ شکست و ناکامی پر عتاب ہے، نہ کسی سلطنت کے عدم قیام پر محاسبہ وہاں صرف دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں، صدق و اخلاص اور اپنی مساعی اور وسائل کا پورا استعمال، اس لحاظ سے شہدائے بالاکوٹ اس دنیا میں بھی سرخرو ہیں اور انشاء اللہ دربارِ الٰہی میں بھی باآبرو کہ انھوں نے اخلاص کے ساتھ اپنے مالک کی رضا کے لیے اپنی مساعی اور وسائل کے استعمال میں ذرہ برابر کمی نہیں کی۔ اُن کا وہ خونِ شہادت، جو ہماری مادّی نگاہوں کے سامنے بالاکوٹ کی مٹی میں جذب ہو گیا اور اس کے جو چھینٹے پتھروں پر باقی تھے، ۲۶ر ذوالقعدہ کی بارش نے ان کو بھی دھو دیا، وہ خون، جس کے نتیجے میں کوئی سلطنت قائم نہیں ہوئی، کسی قوم کا مادّی و سیاسی عروج نہیں ہوا اور کوئی نخلِ آرزو اس سے سرسبز ہو کر بار آور نہیں ہوا، اس خون کے چند قطرے اللہ کی میزانِ عدل میں پوری پوری سلطنتوں سے زیادہ وزنی ہیں۔ یہ فقیرانِ بے نوا، جنھوں نے عالمِ مسافرت میں بے کسی کے ساتھ جان دی اور جن کی اب دنیا میں کوئی مادّی یادگار نہیں، یہ اللہ کے ہاں ان بانیانِ سلطنت اور مؤسسینِ حکومت سے کہیں زیادہ قیمتی اور معزز ہیں، جن کی تصویر قرآن نے ان الفاظ میں کھینچی ہے، وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُسَنَّدَةٌ۔ (المنٰفقون: ۴)

بے شک شہدائے بالاکوٹ کے خون نے دنیا کے سیاسی و جغرافیائی نقشے میں کوئی فوری تغیر نہیں پیدا کیا۔ خونِ شہادت کی ایک مختصر سی سُرخ لکیر اُبھری تھی۔ اس کی جگہ نہ جغرافیہ نویس کے طبعی نقشے میں تھی، نہ مؤرخ کے سیاسی مرقع میں، لیکن کسے خبر کہ یہ خونِ شہادت دفترِ قضا و قدر میں کس اہمیت و اثر کا مستحق سمجھا گیا۔ اس نے مسلمانوں کے نوشتۂ تقدیر کے کتنے دھبے دھوئے اس نے اللہ تعالیٰ کے یہاں، جس کے یہاں محو و اثبات کا عمل جاری رہتا ہے۔ (يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ) (الرعد: ۳) کون سے نئے فیصلے کروائے، اس نے کسی

مستحکم سلطنت کے لیے خاتمہ وزوال اور کسی پس ماندہ قوم کے لیے عروج واقبال کا فیصلہ کروایا، اس سے کس قوم کا بخت بیدار ہوا اور کس سرزمین کی قسمت جاگی۔ اس نے کتنی بظاہر ناممکن الوقوع باتوں کو ممکن بنا دیا اور کتنی بعید از قیاس چیزوں کو واقعہ اور مشاہدہ بنا کے دکھا دیا۔

یوں تو شہدائے بالاکوٹ میں سے ہر فرد کا پیغام یہ ہے کہ یَالَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ۔ (یٰس: ۲۶) مگر گوشِ شنوا اور دیدۂ بینا کے لیے ان کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ ہم ایک ایسے خطۂ زمین کے حصول کے لیے جد وجہد کرتے رہے، جہاں ہم اللہ کے منشاء اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گذار سکیں، جہاں ہم دنیا کو اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کا نمونہ دکھا کر اسلام کی طرف مائل اور اس کی صداقت وعظمت کا قائل کر سکیں، جہاں نفس وشیطان، حاکم وسلطان اور رسم ورواج کے بجائے خالص اللہ کی حکومت واطاعت ہو، وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ (الانفال: ۳۹) جہاں طاعت وعبادت اور صلاح وتقویٰ کے لیے اللہ کی زمین وسیع اور فضا سازگار ہو اور فسق وفجور معصیت کے لیے زمین تنگ اور فضا ناسازگار ہو، جہاں ہم کو صدیاں گذر جانے کے بعد پھر اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ[1] (الحج: ۴۱) کی تفسیر اور تصویر پیش کرنے کا موقع مل سکے۔

تقدیر الٰہی نے ہمارے لئے اس سعادت ومسرت اور اس آرزو کی تکمیل کے مقابلے میں میدان جنگ کی شہادت اور اپنے قرب ورضا کی دولت کو ترجیح دی۔ ہم اپنے رب کے اس فیصلے پر رضامند وخورسند ہیں۔ اب اگر اللہ نے تم کو دنیا کے کسی حصے میں کوئی ایسا خطۂ زمین عطا فرمایا، جہاں تم نے اللہ کے منشاء اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گذار سکو اور اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کے قائم کرنے میں کوئی مجبوری مخل اور کوئی بیرونی طاقت حائل نہ ہو، پھر بھی تم اس سے گریز کرو اور ان شرائط واوصاف کا ثبوت نہ دو،

---

[1] ترجمہ: وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں برائی سے۔ (الحج: ۴۱)

جو مہاجرین و مظلومین کے اقتدار اور سلطنت کا تمغۂ امتیاز ہیں[1] تو تم ایسے کفرانِ نعمت اور ایک ایسی بدعہدی کے مرتکب ہوگے، جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ ہم نے جس زمین کے چپے چپے کے لیے جدوجہد کی اور اس کو اپنے خون سے رنگین کر دیا، اکوڑے اور شیدو کے میدان اور توروا اور مایار کی رزم گاہ سے لے کر بالاکوٹ کی شہادت گاہ تک ہمارے خون شہادت کی مہریں اور ہمارے شہیدوں کی قبریں ہیں۔ تم کو خدا نے اس زمین کے وسیع رقبے اور سرسبز و شاداب خطے سپرد فرمائے اور بعض اوقات قلم کی ایک جنبش اور برائے نام کوشش نے تم کو عظیم سلطنتوں کا مالک بنا دیا۔ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ[2] اب اگر تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور تم نے آزادی کی اس نعمت اور خداداد سلطنت کی اس دولت کو جاہ و اقتدار کے حصول اور حقیر و فانی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا، تم نے اپنے نفوس اور اپنے متعلقین، ملک کے شہریوں اور باشندوں پر خدا کی حکومت اور اسلام کا قانون جاری نہ کیا اور تمہارے ملک اور تمہاری سلطنتیں اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے قانون و سیاست اور تمہارے حاکم اپنے اخلاق و سیرت اور اپنی تعلیم و تربیت میں غیر اسلامی سلطنتوں اور غیر مسلم حاکموں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے تو تم آج دنیا کی ان قوموں کے سامنے، جن سے تم نے مسلمانوں کے لئے الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کیا اور کل خدا کی عدالت میں جہاں اس امانت کا ذرہ ذرہ حساب دینا پڑے گا، کیا جواب دوگے؟ خدا نے تم کو ایک ایسا نادر و زریں موقع عطا فرمایا ہے جس کے انتظار میں چرخ کہن نے سینکڑوں کروٹیں بدلیں اور تاریخ اسلام نے ہزاروں صفحے الٹے، جس کی

---

[1] اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز۔ (۲۲-۳۹-۴۰)

[2] یونس، ع ۲۔ ترجمہ:۔ پھر ہم نے تم کو ان کے بعد زمین میں جانشین کیا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

حسرت و آرزو میں خدا کے لاکھوں پاک نفس اور عالی ہمّت بندے دنیا سے چلے گئے۔ اس موقع کو اگر ہم نے ضائع کر دیا، تو اس سے بڑا تاریخی سانحہ اور اس سے بڑھ کر حوصلہ شکن اور یاس انگیز واقعہ نہ ہوگا، بالاکوٹ کے ان شہیدوں کا، جو ایک دور اُفتادہ بستی کے ایک گوشے میں آسودۂ خاک ہیں، ان سب لوگوں کے لیے جو اقتدار و اختیار کی نعمت سے سرفراز اور ایک آزاد اسلامی ملک کے باشندے ہیں پیغام ہے کہ فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ

حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ[1]

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گذری تھی کہ ہندوستان میں ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جس کا نصب العین وہی تھا جو شاہ صاحبؒ نگاہوں کے سامنے روشن کر کے رکھ گئے تھے۔ سید صاحب کے خطوط اور ملفوظات اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی منصب امامت، عبقات، تقویۃ الایمان اور دوسری تحریریں دیکھئے، دونوں جگہ وہی شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی زبان بولتی نظر آتی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے عملاً جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ حدیث اور قرآن کی تعلیم اور اپنی شخصیت کی تاثیر سے صحیح الخیال اور صالح لوگوں کی ایک کثیر تعداد پیدا کر دی پھر اُن کے چاروں صاحبزادوں نے، خصوصاً شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس حلقے کو بہت وسیع کیا، یہاں تک کہ ہزارہا ایسے آدمی ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے جن کے اندر شاہ صاحبؒ کے خیالات نفوذ کیے ہوئے تھے جن کے دماغوں میں اسلام کی صحیح تصویر اتر چکی تھی، اور جو اپنے علم و فضل اور اپنی عمدہ سیرت کی وجہ سے عام لوگوں میں شاہ صاحبؒ اور ان کے حلقے کا اثر قائم ہونے کا ذریعہ بن گئے تھے، اس چیز نے اس تحریک کے لئے گویا زمین تیار کر دی جو بالآخر شاہ صاحبؒ ہی کے حلقے سے، بلکہ یوں کہئے کہ ان کے گھر سے اٹھنے والی تھی۔

[1] سید صاحب ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء میں شہادت پائی۔
شاہ اسمٰعیل صاحب ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء میں شہادت پائی۔ انقلابی تحریک کی چنگاری سید صاحب کے دل میں غالباً ۱۸۱۰ء کے لگ بھگ زمانے ہی میں بھڑک اٹھی تھی۔

سیّد صاحبؒ اور شاہ اسمٰعیل صاحبؒ دونوں روحاً و معنیً ایک وجود رکھتے ہیں اور اس وجود متحد کو میں مستقل بالذات مجدد نہیں سمجھتا بلکہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہوں۔ ان حضرات کے کارنامے کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) انھوں نے عامۂ خلائق کے دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا جہاں جہاں ان کے اثرات پہونچ سکے وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا کہ صحابۂ کرامؓ کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔

(۲) انھوں نے اتنے وسیع پیمانے پر، جو انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان جیسے برسرِ تنزل ملک میں بمشکل ہی ممکن ہوسکتا تھا، جہاد کی تیاری کی اور اس تیاری میں اپنی تنظیمی قابلیت کا کمال ظاہر کردیا، پھر غایت تدبر کے ساتھ آغاز کار کے لئے شمالی مغربی ہندوستان کو منتخب کیا، جو ظاہر ہے کہ جغرافیائی و سیاسی حیثیت سے اس کام کے لئے موزوں ترین خطہ ہوسکتا تھا، پھر اس جہاد میں ٹھیک وہی اصولِ اخلاق اور قوانین جنگ استعمال کئے جن سے ایک دنیا پرست جنگ آزما کے مقابلے میں ایک مجاہد فی اللہ ممتاز ہوتا ہے، اور اس طرح انھوں نے دنیا کے سامنے پھر ایک مرتبہ صحیح معنوں میں رُوحِ اسلامی کا مظاہرہ کردیا، ان کی جنگ ملک و مال یا قومی عصبیت یا کسی دنیوی غرض کے لئے نہ تھی بلکہ خالص فی سبیل اللہ تھی، ان کے سامنے کوئی مقصد اس کے سوا نہ تھا کہ خلق اللہ کو جاہلیت کی حکومت سے نکالیں اور وہ نظامِ حکومت قائم کریں جو خالق اور مالک الملک کے منشاء کے مطابق ہے، اس غرض کے لئے جب وہ لڑے تو حسب قاعدہ اسلام یا جزیہ کی طرف پہلے دعوت دی، اور پھر اتمام حجّت کرکے تلوار اٹھائی اور جب تلوار اٹھائی تو جنگ کے اس مہذب قانون کی پوری پابندی کی جو اسلام نے سکھایا ہے کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ فعل ان سے سرزد نہیں ہوا، جس بستی میں داخل ہوئے مصلح کی حیثیت سے داخل ہوئے نہ کہ مفسد کی حیثیت سے، ان کی فوج کے ساتھ نہ شراب تھی، نہ بینڈ بجتا تھا، نہ بیسواؤں کی پلٹن ہوتی تھی، نہ ان کی چھاؤنی بدکاریوں کا اڈہ بنتی تھی۔ اور نہ کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ ان کی فوج کسی علاقے سے گذری ہو اور اس

علاقے کے لوگ اپنے مال اور اپنی عورتوں کی عصمتیں لٹنے پر ماتم کناں ہوں، ان کے سپاہی دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اور رات کو جانماز پر ہوتے تھے۔ خدا سے ڈرنے والے، آخرت کے حساب کو یاد رکھنے والے اور ہر حال میں راستی پر قائم رہنے والے، خواہ اس پر قائم رہنے میں ان کو فائدہ پہونچے یا نقصان، انھوں نے کہیں شکست کھائی تو بزدل ثابت نہ ہوئے اور کہیں فتح پائی تو جبار اور متکبّر نہ پائے گئے، اس شان کے ساتھ خالص اسلامی جہاد ہندوستان کی سرزمین میں نہ ان سے پہلے ہوا تھا اور نہ اُن کے بعد ہوا۔

(۳) ان کو ایک چھوٹے سے علاقہ میں حکومت قائم کرنے کا جو تھوڑا سا موقع ملا انھوں نے ٹھیک اس طرز کی حکومت قائم کی جس کو خلافت علی منہاج النبوۃ کہا گیا ہے، وہی فقیرانہ امارت، وہی مساوات، وہی شوریٰ وہی عدل و انصاف، وہی حدود شرعیہ، وہی مال کو حق کے ساتھ لینا اور حق کے مطابق صرف کرنا، وہی مظلوم کی حمایت اگرچہ ضعیف ہو، اور ظالم کی مخالفت اگرچہ قوی ہو، وہی خدا سے ڈر کر حکومت کرنا، اور اخلاق صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا، غرض ہر پہلو میں انھوں نے اس حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا جو کبھی صدیقؓ و فاروقؓ نے کی تھی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی

حضرت سید احمد شہیدؒ اور اُن کی تحریک اصلاح و جہاد

پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے اپنا مندرجہ ذیل مضمون رابطہ ادب اسلامی کے چھٹے مذاکرۂ علمی میں پڑھا تھا، جو ۷، ۹ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو مولانا محمد ثانی حسنی ایجوکیشنل سوسائٹی رائے بریلی کے تعاون سے رائے بریلی شہر میں "حمد و مناجات" کے موضوع پر منعقد ہوا تھا۔ لیکن موضوع اور جگہ کی مناسبت سے صدر رابطہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کی فرمائش پر پروفیسر صاحب نے حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک اصلاح و جہاد کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ زیر نظر شمارہ چونکہ حضرت سید صاحبؒ کی تحریک ہی سے متعلق سیمینار کے مقالات پر مشتمل ہے اس لیے اس مضمون کو اس میں شامل اشاعت کیا جا رہا ہے ——— (ادارہ)

حمد و صلوٰۃ کے بعد اس حقیقت کا اظہار کیا جاتا ہے کہ ایک مدت سے راقم کو رائے بریلی حاضری کی تمنا تھی کہ اس فضا میں کچھ دیر سانس لینے کی سعادت میسر آئے جہاں حکمت ولی اللّٰہی اور سوز عَلَم اللّٰہی نے مل کر نیا پیکر اختیار کیا تھا، اور جہاں سرفروشی اور جانسپاری کی تاریخ لکھی گئی تھی ——— رائے بریلی کو قدرت نے امتیازی خصوصیات سے نوازا ہے۔ یہ صدیوں سے علم و ارشاد کا گہوارہ، شریعت و سنّت نبوی کا مرکز، اور دعوت و عزیمت کا منبع ہے۔ جس فیض کی ابتدا شاہ علم اللہؒ کی نوائے سحری،

سیّد احمد شہیدؒ کے ذوق شہادت اور مولانا حکیم سیّد عبدالحیؒ کے تبحر علمی سے ہوئی تھی، وہ آج مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی ذات گرامی میں ایک نئی قوت بن کر نمودار ہوا ہے ؎

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

زمانے نے کروٹ بدلی ہے اور جہاد بالسیف کی جگہ جہاد بالقلم نے لے لی ہے۔ اور حضرت علی میاں نے اپنی زبان اور قلم سے جس طرح اسلام کی خدمت کی ہے اس سے تاریخ دعوت و عزیمت میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی قیادت میں حکمت ولی اللّٰہی ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے۔ ؏

آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

اُن کی ذات میں عشق، علم اور عمل تینوں کا اجتماع ہے ؎

ضمیر اُمّتاں رامی کند پاک
کلیمے یا حکیمے نے نوازے!

سیّد احمد شہیدؒ کے وطن میں حاضری ایک سعادت ہے۔ حیران ہوں کہ "سرِ خاکِ شہیدان" کیا نثار کروں کہ میرا دامن علم و عمل کی دولت سے خالی ہے۔ ؏

مگر میں نذر کو ایک آبگینہ لایا ہوں

یہ آبگینہ میرا دل ہے جو سیّد شہیدؒ کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور احیاءِ ملّی کے لیے شبانہ روز کوششوں کے احسان کی گراں باری آج بھی محسوس کر رہا ہے ؎

سوزِ دل، اشکِ رواں، آہِ سحر، نالۂ شب
ایں ہمہ از اثرِ لطف شما می بینم!

(۲)

اسلام کی دینی فکر اور سماجی زندگی کا مرکزی نقطہ "توحید" ہے۔ بقول اقبالؔ

یہی دینِ محکم، یہی فتحِ باب
کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

انفرادی زندگی ہو یا حیات اجتماعی، جب یہ عقیدہ قلوب انسانی میں جاگزیں ہو کر احساس وشعور پر اثر انداز ہوتا ہے تو طلسم رنگ و بو ٹوٹ جاتا ہے اور انسانی زندگی میں توانائی کی نئی لہر، عزائم میں نیا ولولہ اور نظر میں نئی تابندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ مالک حقیقی کے سامنے اس کا ایک سجدہ جو اس کو ہزاروں سجدوں سے نجات دلاتا ہے، ملّت کے لیے زندگی کا پیام ہوتا ہے۔ وہ ربّ کائنات سے اپنا رشتہ جوڑ کر تخلیقِ کائنات کا مقصد پورا کرتا ہے۔ اسلامی سوسائٹی میں توحید کی اس زندہ حقیقت کا احساس جب بھی کمزور پڑا، تو وہی کیفیت ہو گئی کہ۔ ؎

تھم گئی جس دم تڑپ، سیماب سیم خام ہے

سیّد احمد شہیدؒ نے مسلمانوں کی تاریخ کے ایک دور ابتلاء و انتشار میں "توحید" کا یہ تصوّر اُجاگر کرنے میں اپنی زندگی قربان کی تھی اور بتایا تھا کہ ؎

لے لا الہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتارِ دلبرانہ، کردار قاہرانہ!

خود ان کی زندگی "گفتار دلبرانہ" اور "کردار قاہرانہ" کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ وہ کل ۴۶ سال (۱۷۸۶ء۔۱۸۳۱ء) اس جہان فانی میں رہے۔ اس مختصر مدّت میں احیاء ملّت کے لیے جو جدوجہد و سعی کی وہ تاریخ بھلا نہیں سکتی۔ ان کی زندگی کا ۳۲ واں سال تھا جب انھوں نے اپنی تحریک کا آغاز کیا، اور اپنی "گفتار دلبرانہ" سے دینی احساس وشعور کو بیدار کرنے اور اسلام کے اس نظام حیات کو سمجھانے میں جو صرف عقیدہ "توحید" کے گرد نشوونما پا سکتا ہے، چار سال شب و روز جدوجہد کرتے رہے۔ پھر ۱۸۲۱ء میں میدان عمل میں سربکف داخل ہوئے، اور "کردار قاہرانہ" کا جیتا جاگتا نمونہ بن گئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا آفتاب علم و ارشاد غروب ہوا چاہتا تھا کہ "سادات قطبی ساکن رائے بریلی کا ایک بزرگ زادہ" ان کی خدمت میں پہونچا۔ اُن کی بوڑھی ہڈیاں جس غم میں پگھلی جاتی تھیں اس کا درماں پیدا ہو گیا۔ ان کے فتوے کو عملی جامہ پہنانے کے اسباب مہیا ہو گئے اور انھوں نے محسوس کیا

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

اس احساس نے کہ حکمت ولی اللّٰہی کو کردار و عمل میں منتقل کرنے والا عالم وجود میں آ گیا

اُن کی شمع زندگی میں نئی روشنی پیدا کردی۔ اپنی مجلسوں میں ان کی "قوی نسبت مجددی" دوسروں کو متأثر کرنے کی غیر معمولی قوت، اور بے حد "ذکی القلب" ہونے کا ذکر بڑے جذبے سے کیا۔ (ملفوظات ص ۵، ۲۷) ادھر خاندان ولی اللّٰہی کی عظیم المرتبت شخصیتیں جنھوں نے "حضرات ثلاثہ" کی صحبت میں تربیت پائی تھی، ان کے جھنڈے کے نیچے اس طرح جمع ہوگئیں گویا اُن کے انتظار میں چشم براہ تھیں ؎

تو نخل خوش ثمر کیستی؟ کہ باغ و چمن
ہمہ زخویش بریدند و در تو پیوستند

ان حضرات کا سید شہیدؒ کے دامن تربیت سے وابستہ ہونا، اعلان تھا اس بات کا کہ اب حکمت ولی اللّٰہی کا نیا دور ان کی قیادت میں شروع ہوگا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسے مولانا محمد یعقوبؒ کا بیان ہے کہ:۔

"شاہ عبدالعزیزؒ کی توجہ کی تاثیر مثل ہلکے سے مینھ کے ہوتی ہے جس کی چھوٹی چھوٹی بوندیں ہوتی ہیں، لیکن سید صاحب کی تاثیر مثل لوہاروں کی بھٹی کے اثر کرتی ہے جو فوّارہ کی طرح قلب پر پڑتی ہے" (سوانح احمدی، جعفر تھانیسری ص ۴۱)

یہ فرق تھا ایک معلّم اور ایک مجاہد کے انداز فکر و عمل کا۔ تجدید و تدوین علوم کا کام ختم ہوچکا تھا، جہاد و عمل کا میدان کھل گیا تھا۔ مسند درس کی جگہ اب میدان کارزار نے لے لی تھی۔ اس کے مرد میداں سید شہیدؒ تھے ؎

بدن اس تازہ جہاں کا ہے اسی کی کف خاک
روح اس تازہ جہاں کی ہے اسی کی تکبیر

(۳)

سید احمد شہیدؒ نے جس زمین میں آنکھ کھولی اور جس روح پرور فضا میں تربیت پائی تھی وہ پھلت کی طرح "قریۃ الصالحین" تھا۔ یہاں شاہ علم اللہؒ نے اتباع سنّت کی وہ عظیم الشان روایت قائم کی تھی، جس سے اورنگ زیب عالمگیر بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ شاہ غلام علی دہلویؒ کے ملفوظات "درّ المعارف" میں ہے کہ اورنگ زیب نے ایک خواب دیکھا تھا جس

کی تعبیر علماء نے یہ بتائی کہ سنّت نبوی کا کوئی زبردست اتباع کرنے والا دنیائے فانی سے رخصت ہوا۔ اسی رات شاہ علم اللہؒ نے وصال فرمایا۔

شاہ علم اللہؒ نے جب رائے بریلی میں اپنا رخت سفر کھولا اور قیام کا فیصلہ کیا تو یہاں کی دینی زندگی میں حرارت پیدا ہوگئی اور یہاں کے بام و در تکبیر و اذان کی صداؤں سے گونج اٹھے۔ رفتہ رفتہ رائے بریلی حضرت مجدّد صاحبؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ دونوں کی علمی، دینی اور اصلاحی تحریکوں کا مرجع بن گیا۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاید ؏

چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن

حضرت مجدد صاحب کے خلیفہ حضرت شاہ آدم بنوریؒ سے حضرت شاہ علم اللہؒ نے بیعت کی، اور ان سے خلافت اس بشارت کے ساتھ پائی کہ تمہاری حیثیت ستاروں میں آفتاب کی ہوگی۔ سیّد شہیدؒ کے نانا شاہ ابو سعید حسنیؒ نے شاہ ولی اللہؒ سے کسب فیض کیا۔ ان کے متعلق شاہ ولی اللہؒ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"ایں راہ کہ میروند ہما طریقِ مستقیم است"

خطوط سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان ولی اللّٰہی اور خاندان علم اللّٰہی میں گہرا ارتباط اور تعلق تھا۔ دونوں گھرانوں کی خواتین کے بھی آپس میں مراسم تھے۔ شاہ ابو سعیدؒ نے مالی مشکلات میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مدد کی تھی۔ شاہ ولی اللہؒ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"چنانچہ ایں نیاز مند را از فکر معاش نجات بخشیدند، او جلّ علا از جمیع حاجات از دین و دنیا ذات سامی را خلاص و نجات عنایت فرماید۔"

شاہ ابو سعیدؒ، شاہ اہل اللہؒ، شاہ ابو اللیث حسنیؒ، شاہ محمد عاشقؒ، شاہ عبدالعزیزؒ کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ مدّتوں جاری رہا۔ چنانچہ جس سرزمین میں سیّد احمد شہید نے آنکھ کھولی وہاں احیاء ملّت کی تحریکوں کا دل دھڑک رہا تھا۔

(۴)

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تفہیمات الٰہیہ میں ایک جگہ اشارہ کیا کہ اگر موقع محل کا اقتضا ہوتا تو میں جنگ کر کے عملاً اصلاح کرنے کی قابلیت اور صلاحیت رکھتا تھا۔ (جلد اول ص۱۰۱)

حالات کا یہ تقاضا نہ تھا اس لیے وہ خاموش رہے۔ گو "فلک کُلّ نظام" کی صدائیں ان کی مسند درس سے بلند ہوتی رہیں (فیوض الحرمین) کچھ عرصہ بعد جب حالات نے ایک مجاہد کو پکارا تو سیّد احمد شہیدؒ نے لبیک کہا اور ان ہی کے گرد خاندان ولی اللّٰہی کے بہترین دماغ جمع ہو گئے حقیقت یہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کی دینی اور اصلاحی تحریک سیّد احمد شہیدؒ کے ہاتھوں تکمیل کو پہونچی۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک کا مرکز و محور یہ اعتقاد تھا کہ توحید خالص کی حقیقی روح اگر مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں واپس آجائے تو پھر ان کی زندگی کا نقشہ بدل جائے۔ ہندوستان کی تاریخ میں توحید کی سربلندی کے لیے عملی میدان میں جد و جہد کی اس سے بڑھ کر کوئی دوسری تحریک منصۂ شہود پر نہیں آئی۔ اس بنیادی مقصد کے حصول کے لیے سیّد شہیدؒ نے تین چیزوں پر زور دیا۔

احیاء سنّت

اماتت بدعت

تلقین جہاد

صحیح اسلامی روح بیدار کرنے کے لیے ضروری تھا کہ بدعات کا خاتمہ کیا جائے اور زندگی کے ہر شعبہ میں سنّت نبوی کے اتباع کا جذبہ اُبھارا جائے۔ عقائد کی اصلاح اور سماجی خرابیوں کا ازالہ، احیاء ملّت کے لیے از بس ضروری تھا پھر سیاسی اقتدار کو غیر ملکی ہاتھوں سے نکالنے کے لیے جہاد کی روح پھونکنا وقت کا سب سے بڑا تقاضا تھا۔

اسلام کی دینی فکر میں جہاد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ احیاء ملّت کے لیے یہ نسخہ اللہ کے صرف وہ بندے استعمال کر سکتے ہیں، جنھوں نے اپنے لیے جینا چھوڑ دیا ہو اور جن کی زندگی اور موت اپنے رب کے لیے ہو۔ عزم جہاد کرنے والے کو پہلے اپنے نفس سے جہاد پر کمربستہ ہونا پڑتا ہے۔ خواجہ محمد معصومؒ نے شاہزادہ اورنگ زیب کے نام ایک خط میں جہاد کی اس اہمیت

پر بڑے دل نشیں انداز میں گفتگو کی ہے۔ ہندوستان میں اللہ کی راہ میں جہاد کی تلقین، اور اس پر عمل کی سعادت سیّد احمد شہیدؒ کے لیے مقدّر تھی۔ انھوں نے اس تصوّر کو اس طرح مسلمانوں کے ذہن و دل پر نقش کر دیا کہ مدّتوں تک انگریز مدبّرین اور مصنّفین کی کوششیں اسی تصوّر کو ذہن سے مٹانے میں صرف ہوئیں اور ان ہی کے زیر اثر بعض علماء اور دانش وروں نے جہاد کو غیر اسلامی بتانے میں اپنی علمی صلاحیتیں استعمال کیں۔

اقبالؔ نے ابلیس کی مجلس شوریٰ میں ایک مشیر کی زبان سے کہلوایا ہے ؎

کس کی نومیدی یہ حجت ہے یہ فرمان جدید
ہے جہاد اس دور میں مرد مسلماں پر حرام

فری لینڈ ایبٹ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ قرون وسطیٰ کے وہ حالات جو جہاد کو کامیاب بنانے کا باعث بنے تھے، سیّد احمد شہیدؒ کے زمانہ میں نہیں رہے تھے۔ گویا یہ وقت کی صدا تھی جو انھوں نے بلند کی (THE MUSLIM WORLD, JULY 1962) لیکن یہ خیال جہاد کی حقیقی نوعیت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اور اسی انداز فکر کا رجحان ہے جو مستشرقین نے عموماً سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے۔

برطانوی اقتدار کی طرف سے تصور جہاد کو مٹانے کی کوششیں ایک طرف پورے زور و شور سے جاری تھیں، دوسری طرف منشی عبدالرزّاق صاحب کلامی کی فتوح الشّام (واقدی) کا منظوم ترجمہ صمصام الاسلام کے نام لکھ کر اس تصور کو زندہ رکھنے کی جہد و سعی جاری تھی۔ سیّد احمد شہیدؒ کے بعد تصوّر جہاد پر مختلف زاویہ ہائے نظر سے جو لکھا گیا ہے، اس کا تجزیہ بعض تاریخی حقائق کا پس منظر سمجھنے کے لیے ازبس ضروری ہے۔ روح اسلامی کو مجروح کرنے کے لیے جہاد کے تصوّر کو مسلمانوں کے مذہبی احساس و شعور سے نکالا گیا تھا۔

(۵)

اسلامی تاریخ کے وسیع پس منظر میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ عشق، علم اور عمل ان تین قوتوں نے اکثر مل کر اور کبھی کبھی علیحدہ علیحدہ مسلمانوں کی حیات اجتماعی کو توانائی بخشی ہے۔ اور ان ہی کے ذریعہ اسلامی فکر و تمدّن کا قافلہ آگے بڑھا ہے۔ اور اثر و نفوذ کی قوتیں بروئے

کارآئی ہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کبھی حالات کے تقاضے نے کسی مخصوص سمت میں ایک قوت کا رجحان زیادہ کر دیا لیکن مجموعی طور پر یہ صلاحیتیں اسلامی تاریخ میں مختلف عنوان سے سرگرم عمل رہیں ۔ ہندوستان کی تاریخ پر اس زاویہ سے نظر ڈالی جائے تو پانچ شخصیتوں کے اثرات دوررس نتائج کے حامل نظر آئیں گے ۔ خواجہ معین الدین حسن سجزی اجمیریؒ، شیخ نظام الدین اولیاءؒ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ اُن کے کارناموں کی حقیقت اور ان کی مساعی کا رخ سمجھے بغیر ہندوستان میں اسلام کی تاریخ کا جائزہ ممکن نہیں۔

خواجہ اجمیریؒ اور حضرت محبوب الٰہی نے "عشق" کو رہبر بنایا اور شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے الفاظ میں "دل کی دکانیں" لگا دیں جہاں جذب و شوق، سوز و مستی کا سودا ملتا تھا۔ خود ان کی زندگیاں اس حقیقت کی ترجمان بن گئیں ؎

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفٰے
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

"صراط مستقیم" کے باب اوّل میں جس "تاثیر حُبّ عشق" کا ذکر ہے، یہ وہی عشق حقیقی ہے جس نے ان بزرگوں کے دل کو گرمایا تھا۔ اسی کے ذریعہ انھوں نے اسلامی اثرات کا دائرہ وسیع کیا اور اسلام کی "وحدت خیز" قوت نے ہندوستان کی سماجی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ راقم الحروف نے ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM میں ہندوستان میں اسلام پر اپنے مضمون میں اس کو دور تبلیغ و اشاعت اور اثر و نفوذ سے تعبیر کیا ہے۔ پھر ایک ایسا دور آیا جب خود اسلامی معاشرہ کی اصلاح، وقت کا سب سے بڑا تقاضا بن کر سامنے آئی۔ اور سرمایۂ ملت کی نگہبانی کے احساس نے دلوں کو بے چین کر دیا۔ اب عشق سے زیادہ علم کی ضرورت تھی تاکہ علم کے ذریعہ آنے والی گمراہیوں کا سدّباب کیا جا سکے۔ مجدد صاحبؒ نے سیاسی اقتدار کے پورے عروج کے زمانہ میں اُن غلط نظریات کی ترویج کو سختی سے روکا جو دربار سے نکل کر عوام کی زندگی پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ انھوں نے مذہبی فکر کو احداث و بدعات سے پاک کیا۔ عقائد کا فساد جن فکری گمراہیوں کے سہارے بڑھ رہا تھا، اس پر بند لگائے، پھر شاہ ولی اللہؒ نے سیاسی انحطاط اور فکری انتشار کے زمانہ میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید کی طرف

توجہ کی۔ اور جو نئی قوتیں اور نئے سماجی اور عمرانی نظریات ابھی کارگہ فکر میں تھے، ان سے نبرد آزما ہونے کا سامان مہیا کردیا۔ حجۃ اللہ البالغہ کا ایک ایک صفحہ پکارتا ہے ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

پھر سید احمد شہیدؒ نے جب اپنی تحریک کا آغاز کیا تو حالات عمل اور جہاد کا مطالبہ کررہے تھے، مجدد صاحبؒ نے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے زمانہ میں کام کیا تھا، شاہ ولی اللہ دہلوی نے دور انحطاط میں نئے نظام کی تصویر دکھائی تھی، لیکن عملی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ سید احمد شہیدؒ جب میدان میں داخل ہوئے تو حالات کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار تاریخ کے دھندلکوں میں کہیں غائب ہوچکا تھا۔ انگریز پورے سامراجی عزائم کے ساتھ اپنے اقتدار کو جمانے میں مصروف تھے۔ اسلامی شعائر پر اضمحلال کی جو کیفیت طاری تھی اس کا اندازہ "صراط مستقیم" کے باب دوم کے مباحث سے لگایا جاسکتا ہے۔ عقیدہ توحید جس پر اسلامی سوسائٹی کے وجود کا انحصار تھا، غیر اسلامی تصورات میں الجھ کر رہ گیا تھا، اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ:۔

تمدن، تصوف، شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھوگئی
یہ اُمت روایات میں کھوگئی

مسئلہ صرف سیاسی اقتدار ہی کی واپسی کا نہیں تھا، بلکہ احداث و بدعات میں کھوئی ہوئی اُمت کی بازیافت کا تھا۔ اور اس کے لیے زندگی کے ہر شعبہ میں مجاہدانہ جہد و سعی درکار تھی۔

سیاسی اقتدار نے دم توڑا تو معاشی حالات بھی بدل گئے۔ مسلمانوں کی زندگی سوز "لا" سے محروم ہوئی تو خانقاہیں سیرت سازی کے کام سے ناآشنا ہوگئیں۔ اور مدرسے اپنے مقصد و منہاج کو بھول گئے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ بقول اقبالؔ ؎

نہادِ زندگی میں ابتدا لا انتہا الا

پیام موت ہے جب لا ہو الا سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی لا سے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہو البریز اس ملت کا پیمانہ

تاریخ عالم گواہ ہے کہ جب بھی تاریخ ساز شخصیتوں نے اپنے کام کا آغاز کیا ہے، اپنے پیکر خاکی میں عزم اور ہمت کے سوتے اُبلتے ہوئے محسوس کئے ہیں۔ ان کے دلوں میں اس اعتقاد اور یقین نے ایک جوش اور ولولہ پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے اس کام کی انجام دہی پر مامور ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ تفہیمات میں لکھتے ہیں:۔

"بہ سرم در دادند کہ ایں حقیقت بمردم برساں۔ امروز وقت وقت تست، وزماں زمان تو۔ وائے بر کسے کہ زیر لوائے تو نباشد"

حضرت سید احمد شہیدؒ کے دل میں بھی یہ خیال ایک قوت عمل بن گیا تھا کہ قدرت ان سے خاص کام لینا چاہتی ہے۔ اور وہ اس کی انجام دہی پر متعین ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"فقیر دریں باب باشارات غیبی مامور است و بہ بشارت لاریبی مبشر، ہرگز ہرگز شعبۂ وسوسۂ شیطانی و شائبۂ ہوائے نفسانی بایں الہام رحمانی ممتزج نیست"

(خط ۳ ص ۳۰، برٹش میوزیم مخطوطہ)

اس وقت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر اور حکمت کے تمام اجزائے ترکیبی رائے بریلی میں جمع تھے اور سید احمد شہیدؒ ان کا علمی پیکر بن کر تاریخ کو نیا رخ دے رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا تو یہ خیال تھا کہ اگر شاہ ولی اللہؒ بھی اس وقت زندہ ہوتے تو ان کو بھی حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (خلیفہ و رفیق تربیت یافتہ) سید احمد شہیدؒ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونا پڑتا۔ لکھتے ہیں:۔

"حضرت شاہ ولی اللہؒ کا مقام ہر رنگ میں کس درجہ جامع و کامل ہے؟ بایں ہمہ یہاں جو کچھ ہوا، تجدید و تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحاب استعداد تک محدود تھا۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مرد میداں کا منتظر تھا۔ اور معلوم ہے کہ توفیق الٰہی نے یہ معاملہ حضرت علامہ و مجدد شہید رضی اللہ عنہ کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ خود حضرت شاہ

صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا۔۔۔ اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو اُن ہی کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔" (تذکرہ ص ۲۷۰)

پھر اصحاب ثلاثہ، یعنی شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:۔

"حضرت شاہ عبدالعزیز کے درس و تدریس کی بادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم و عمل کے آفتاب تھے۔ خاندان سے باہر اگر ان کے تربیت یافتوں کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں ان کا فیضانِ علم کام نہ کر رہا ہو۔۔۔۔۔۔ لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ وہ گویا ایک خاص پہناوا تھا جو صرف ایک ہی جسم کے لیے تھا اور ایک ہی پر چست آیا۔ دنیا اس کے خلعت عظمت اور تشریف قبول کاندھے پر ڈالے منتظر کھڑی تھی۔"

مولانا آزاد کا یہ خیال بالکل صحیح ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو معاملہ کچھ اور آگے ہی نظر آئے گا۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں سیکڑوں خاندان اور بے شمار حکمراں اقتدار کے حامل بنے لیکن وہ گوشہ جہاں سیّد شہیدؒ نے اپنی تحریک کو منظّم کرنے کے لیے اسلام کا سیاسی نظام نافذ کیا تھا، وہ اسلام کا حقیقی قدم تھا جو اس سرزمین پر رکھا گیا۔ ہندوستان کے کسی اور حصّے میں اور تاریخ کے کسی اور دور میں قرونِ اولیٰ کا نظامِ حیات اس طرح ایک زندہ حقیقت کے طور پر چشمِ عالم نے مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ارضِ الہند کا یہ تھوڑا سا ٹکڑا، زمان و مکان کی ساری بندشوں کو توڑ کر عہدِ صحابہ میں جا ملا ہے۔

سیّد احمد شہیدؒ نے سرحدی علاقہ میں جو حکومت کا نظام قائم کیا تھا اس کا مقصد اسلامی نظامِ حیات کا ایک نقشہ پیش کرنا تھا۔ انھوں نے عمل کیا تھا امام ابن تیمیہؒ کی اس ہدایت پر کہ بغیر امام مسلمانوں کی زندگی، غیر ملکی تسلّط کے زمانہ میں منظم نہیں ہو سکتی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"قیام دین بملک است، واحکام دینیہ کہ تعلق بحکومت دارند، بوقت نبودن

مملکت صاف از دست می روند"

ان کی نظر آفاقی تھی، اُن کا مطمحِ نظر یہ تھا:۔

"ایں قدر آرزو دارم کہ در اکثر افراد بنی آدم بلکہ جمیع اقطار عالم احکام حضرت رب العالمین کہ مسمّٰی بشرع متین است بلا منازعت احدے نافذ گردد"

پہلے دعوت اور اس کے بعد عزیمت اور عمل سنّت نبویؐ ہے۔ جب کسی تحریک کا آغاز ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کی فکری اساس مضبوط کی جاتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے مکّہ معظّمہ میں آیات مکّی کے ذریعہ تمام انسانیت کو مخاطب کر کے اپنا پیغام پہونچا دیا۔ پھر مدینہ منوّرہ میں ان اصولوں کو زندہ حقیقت بنا کر پیش کیا اور خطاب مومنین سے کیا کہ اُن پر اس نظام کو چلانے کی ذمّہ داری تھی۔

سید احمد شہیدؒ نے اپنی زندگی کے کئی سال ذہنی فضا کے تیار کرنے میں صرف کئے اور پھر جہاد کی تیاری میں لگ گئے۔ اور بالآخر اللہ کے اس فرمانبردار بندے نے اپنی زندگی اس کی راہ میں اس طرح قربان کر دی کہ فضائیں تک پکار اٹھیں ؎

ظہورِ عشق حقیقت طراز تھا ورنہ
یہ دل کشی کہیں دار و رسن میں آئی ہے

سیّد احمد شہیدؒ نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کو سب سے بڑا صدمہ بیرونی اقتدار سے پہونچا ہے چنانچہ انھوں نے ملک کو غیر ملکی تسلّط سے نجات دلانا اپنے جہاد کے مقاصد میں شامل کیا۔ گوالیار کے ہندو راؤ اور چترال کے شاہ سلیمان کے نام ان کے خطوط، ان کے مقاصد کے بہترین آئینہ دار ہیں۔ ہندو راؤ کو لکھتے ہیں:۔

"بر رائے سامی روشن و مُبرہن است کہ بیگانگان بعید الوطن ملوک زمین و زمن گردیدہ و تاجران متاع فروش بپایۂ سلطنت رسیدہ، امارت امرائے کبار و ریاست روسائے عالی مقدار برباد نمودہ اند و عزّت و اعتبار ایشاں بالکل رفتہ چوں اہل ریاست و سیاست در زاویۂ خمول نشستہ اند، ناچار چندے اہل فقر و مسکنت کمر ہمّت بستہ ایں جماعت ضعفاء محض بنا بر خدمت دین رب العالمین برخیستند"

ہندو راجہ سے یہ کہنا کہ "دین ربّ العالمین" کی خدمت کا جذبہ میدان میں لایا ہے، بیحد اہم ہے۔ غلام حیدر خاں کے نام مکتوب میں بھی انھوں نے اس "جور وظلم" کا ذکر کیا ہے جو انگریزوں نے ملک پر ڈھائے تھے۔ اُن کی آواز میں اللہ نے غضب کی تاثیر دی تھی، جس کو سن کر نہ صرف دل سینوں میں تڑپنے لگتے تھے بلکہ سر جسم پر بوجھ بن جاتا تھا اور ذوق شہادت میں لب پر دعا آجاتی تھی ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

ہندوستان کی تاریخ میں جان قربان کرنے کے لیے ایسا جذبہ پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ جب در و دیوار سے یہ صدائیں آتی تھیں۔

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا
فدا جی سے راہ خدا میں ہوا
حبیبِ حبیبِ خداوند ہے
خداوند اس سے رضامند ہے
امامِ زمانہ کی یاری کرو!
خدا کے لئے جانثاری کرو

(مومن)

مائیں لوریوں میں اپنے بچّوں کے لیے شہادت کی دعائیں مانگنے لگیں۔ انسانی جذبات کا یہ تلاطم اسلامی ہند کی تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ امروہہ کے شاہ محمد امین غازی حضرت شہیدؒ کے زمرۂ مجاہدین میں شامل تھے۔ ایک مثنوی میں اپنے اکلوتے بیٹے روح الامین کے لیے دعا کرتے ہیں۔

چناں خواہم آں پاک پروردگار
کہ روح الامیں را کنی بختیار
مجاہد چنانش کن اندر غزا

کزو تا رسد بر نصاریٰ سزا

اُن کی "مثنوی فیروز شاہ" کا ایک نادر قلمی نسخہ خاکسار کے ذخیرہ کتب میں ہے جس سے ان کے جذبات و احساسات کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہندوستان میں اب تک مسلمان حکومتوں کی طرف سے دو جنگیں لڑی جا چکی تھیں ـــــ جنگ پلاسی اور جنگ سرانگاپٹم۔ یہ سید شہیدؒ کے منصۂ شہود پر آنے سے پہلے لڑی گئی تھیں جنگ بالاکوٹ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی عوامی جنگ تھی جو آزادی، حریت اور اخلاقی، قدروں کے احیاء کے لیے مسلم عوام نے سید شہیدؒ کی قیادت میں لڑی۔ مومن نے جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے دامن تربیت سے وابستہ تھے، مثنوی جہادیہ میں لکھا تھا ؎

این عیسویاں بہ لب رساندند — جان من و جاں آفرینش
مگزار کہ پائماں گردیم! — زاں سیم سراں آفرینش
تا چند بہ خواب ناز باشی — فارغ ز فغاں آفرینش
مومن شدہ ہم زبان عرفی — از بہر آماں آفرینش

برخیز کہ شور کفر برخاست
اے فتنہ نشان آفرینش

یہی انداز مولانا محمد امین غازی کا تھا۔ لکھتے ہیں:۔

زبد دینیٔ حاکمان زمن
نشان حیا نیست در مرد و زن
زبد دینیٔ حاکمان زمن
حیا روئے پوشید و رفت از جہاں
بجاں آمدیم از تعدّی شاں
بسے الاماں المدد الاماں

مولانا خرم علی بلہوری نے قصیدہ جہادیہ لکھا جو اتنا پُر تاثیر تھا کہ مجاہدین لڑائی کے وقت اس کو پڑھتے اور بے خود ہو جاتے تھے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ نے کلکتہ سے لے کر بالاکوٹ تک جہاد کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ ان کی نگاہ کی یہ تاثیر تھی کہ جس کی طرف دیکھ لیا وہ دار و رسن کی تمنا میں اپنے روز و شب بسر کرنے لگا۔ اسلامی ہند کی تاریخ میں کوئی اسلامی تحریک ایسی نمودار نہیں ہوئی تھی جس کا دائرہ اثر و نفوذ اتنا وسیع ہوا ہو جس نے ہر چھوٹے بڑے کے دل کو جذبۂ جہاد سے گرمایا ہو۔ سر سید کا بیان ہے:۔

"شہر کلکتہ میں جب تک آپ نے تشریف رکھی، شراب مطلق نہ بکنے پائی، اور کلال خانہ بند رہا اور اس نواح میں آپ کے مریدوں کی تعداد لکھوک سے گذر گئی تھی"

(آثار الصنادید)

وہ کلکتہ میں ساڑھے تین یا پونے چار مہینے ٹھہرے تھے۔ پرنسپ (PRINCEP) کے بیان کے مطابق کلکتہ کے باشندوں کی بڑی تعداد اس زمانہ میں اُن کی پیرو ہو گئی تھی۔ بقول حسن ؎

تیری تائید سے اک خلق ہوئی ہے تائب
تیری تنبیہ سے لاکھوں ہوئے فاسق اطہر

روسی مصنف جو ہر تحریک میں مزدور اور کاری گر طبقوں کی شرکت سے اس کی اہمیت اور دائرہ اثر و نفوذ کا اندازہ کرتے ہیں، اس تحریک کے عوامی رنگ سے متأثر ہیں E.N. KAMAROV کا خیال ہے کہ تحریک نے Lower urban stratum نچلے شہری طبقے کو خاص طور پر متأثر کیا تھا۔ لکھتا ہے:۔

Its main force were the popular masses

(NEW THOUGHT, FEB. 1, 1961)

اس نے ایک برطانی افسر کی رپورٹ کا ذکر کیا ہے جس میں اس نے اعظم گڈھ کے نو باغوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سید شہیدؒ کی تحریک سے متأثر ہو کر آمادۂ بغاوت ہو گئے ہیں جن حلقوں سے سید شہیدؒ پر اعتراض کئے گئے ہیں ان کی آنکھیں جذبات کے اس طوفان کا ساحل سے بھی نظارہ نہ کر سکیں جو انھوں نے ہمالیہ کی چوٹیوں سے لے کر خلیج بنگال کے کناروں تک پیدا کر دیا تھا۔

کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی
اے پیر حرم تیری مناجات سحر کیا

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کی ساری مذہبی، سیاسی اور اصلاحی تحریکیں سید شہیدؒ کے گرد جمع ہو گئی تھیں اور اسلامی ہند کا مرکز ثقل ان کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ خاندان ولی اللہی تو اُن کے گرد جمع تھا ہی، ٹیپو سلطان کے خاندان کے وہ افراد جو اپنی حریت پسندانہ سرگرمیوں کے باعث ویلور کی سرکشی کے بعد کلکتہ منتقل کر دیئے گئے تھے، حضرت شہیدؒ کے دامن تربیت سے وابستہ ہو گئے۔ دکن میں نواب مبارز الدولہ نے سید شہیدؒ کے نمائندوں سے رابطہ اور تعلق پیدا کیا، بنگال میں فرائضی تحریک نے مجاہدین کے لئے جگہ چھوڑ دی۔ میر نثار علی عرف تیتو نے حضرت شہیدؒ کے دامن میں پناہ لی۔ انھوں نے ۱۸۳۱ء میں نرکل بریا میں بانسوں کی ایک مضبوط فصیل بنائی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ تعجب خیز واقعہ ہے کہ بالاکوٹ اور نرکل بریا، دونوں مقامات پر ـــــ جن کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہے ـــ شہادت کے میدان ایک ہی وقت میں گرم ہوئے اور مجاہدین کے قافلہ سالار حضرت سید احمدؒ نے بالاکوٹ کے میدان میں جام شہادت پیا، اُدھر بنگال میں نرکل بریا کے میدان میں مجاہدین کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ جو مجاہدین بچ گئے وہ علی پور جیل پہونچا دیئے گئے اور بس۔

پھر نہ کچھ دیکھا، بجز شعلہ پر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

حضرت شہیدؒ کے مکتوبات اُن کی تحریک جہاد کے مقاصد، اُن کے طریقۂ کار اور اُن کے نظام حکومت کے بنیادی اصول سمجھنے میں بے حد معاون ہیں۔ یہاں چند اہم پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی جا سکتی ہے:۔

(۱) انھوں نے بار بار اس کی وضاحت کی ہے کہ انھوں نے محض اللہ کی خاطر جہاد کا قدم اٹھایا ہے۔ حکومت و اقتدار، مال و دولت ان کا مقصود و مطلوب نہیں۔ اقبالؔ کا یہ شعر ان کے مقاصد کا بہترین ترجمان ہے۔

شہادت ہے مقصود و مطلوب مومن ۔۔۔ نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی

اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ اپنے بنیادی مذہبی افکار کو ایک صالح نظامِ حکومت کی شکل دینا نہیں چاہتے تھے۔ اس نظام کے بغیر وہ "توحید" کو ایک زندہ حقیقت کے طور پر پیش نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے کابل، ہرات، بخارا وغیرہ کے حکمرانوں کو اپنی تحریک کے مقاصد سے واقف کرانے کے لیے خطوط لکھے تھے۔ جن سے ان کے دینی مقاصد پر روشنی پڑتی ہے۔ شاہ سلیمان والی چترال کے نام خط میں انھوں نے (۱) حکومت کے نصاریٰ کے ہاتھ میں پہونچ جانے (۲) غلبہ شرک وکفر اور (۳) شعائرِ اسلام کے خاتمہ پر اپنے دل کی بے چینی کا اظہار کیا ہے۔ اور یہی تین مقاصد اُن کی تحریک کے تھے۔

(۲) علاقہ بالاکوٹ کا انتخاب کرنے سے پہلے انھوں نے "ہند وسند وخراسان" کے سب اہم مقامات کا سفر کیا تھا اور تحریک کا BASE OF OPERATINO بنانے کی نظر سے جائزہ لیا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"در بلاد ہند وسند وخراسان دور دیر نمودیم در تمامی آئین سیاحت کوہ و دشت فقط طالب خیر بودیم۔ آخر الامر در مثل ایں بلاد دور دست گردیدہ وتمامی ایں کوہ ودشت نور دیدہ را اوطان یوسف زئی رسیدیم"

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم ص ۲۰)

"شوقِ ہجرت" "غیرتِ ایمانی" اور "جوشِ اقامتِ جہاد" کی خاطر وہ علاقہ بالاکوٹ میں پہونچے تھے اور یہاں پہونچ کر انھوں نے محسوس کیا۔

ایک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب

اس زمین کے لیے مشیّت ایزدی نے یہ شرف وافتخار مقدر کیا تھا کہ یہاں عشقِ الٰہی سے سرشار ایک قافلہ اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کرنے کے لیے پہونچے گا۔

لیکن بالاکوٹ کو مرکز بنانے کا فیصلہ جذباتی نہیں تھا۔ یہ حقائق کی روشنی میں مصالح کے پیشِ نظر تھا جس کا اندازہ مکتوبات سے ہوتا ہے۔

(۳) مجموعۂ مکتوبات میں بعض "امان نامے" بھی نقل کیے گئے ہیں۔ اُن سے مقاصد اور

وسیع حلقۂ اثر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک "امان نامہ" سوہبا اور تلسی کے نام اس مضمون کا ہے:۔

"امان نامہ بنام سوہبا و تلسی و گنگو و سونہا مع پسران بشرط بجا آوری خدمت لشکر"

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم ص ۲۶۶)

پھر ایک مسلمان کے لیے "امان نامہ" کا مضمون ہے:۔

"سلام الدین و فقیر محمد و عباس از اولاد میاں مصری بشرط اتباع شرع و ادائے زکوٰۃ وغیرہ حقوق اللہ"

(قلمی نسخہ ص ۲۶۶)

ان دو "امان ناموں" میں اسلامی نظام حکومت کی پوری جھلک نظر آتی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ انھوں نے ہندوؤں سے تعلقات نہایت خوشگوار رکھے۔ اسمتھ (W.C. SMITH) نے تحریک کے سیاسی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کا کوئی رُخ ہندوؤں کے خلاف نہیں تھا۔

None of these political activities however was anti-hindu

(MODERN ISLAM IN INDIA P. 192)

"ان کی سیاسی سرگرمیوں میں کوئی بات ہندوؤں کے خلاف نہیں تھی"

تحریک کا سکھوں کے خلاف ہونا بھی اب تاریخ سے ثابت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جو طاقت بھی راہ میں حائل نظر آئی اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہو گیا، لیکن بنیادی طور پر تحریک کا مقصد سکھوں سے نبرد آزمائی نہیں تھی۔ مکتوبات میں جس طرح "نصاریٰ" "نکوہیدہ خیال" کی جگہ "سکھان نکوہیدہ خصال" اور "کفار فرنگ بر ہندوستان تسلط یافتہ" کو "کفار دراز مویان کہ بر ملک پنجاب تسلط یافتہ" میں تبدیل کیا گیا ہے وہ تاریخ کی انتہائی شرمناک جعل سازی ہے۔ لیکن اس کا تجزیہ کرتے وقت غیر ملکی اقتدار کے ان مظالم پر نظر ہونی ضروری ہے جن سے مجبور ہو کر یہ تحریکیں کی گئی تھیں۔

(۴) مکتوبات سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ جنگ و جدال کا دائرہ مختصر

رکھنا چاہتے تھے۔ اپنے صلح اور امن کے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے لالہ رام سنگھ کو جنگ بالاکوٹ سے دو سال قبل (۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء کو) لکھتے ہیں:۔

من بندۂ پروردگارم، ہر کس کہ پیغام صلح فرستد از طرف خود جنگ پیش نمی کنم"

ظاہر بین نگاہوں کو شاید ۱۸۳۱ء میں تحریک جہاد کا خاتمہ نظر آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ

جلے، جل کر بجھے بھی چشم صورت بیں میں پروانے
فروزاں کر گئے وہ نام لیکن شمع سوزاں کا

وقتی طور پر ان کو ناکامی ضرور ہوئی لیکن ان کی تحریک نے سرفروشی کا جو جذبہ پیدا کر دیا تھا وہ ایک عرصہ تک قلب و جگر میں شعلہ کی طرح بھڑکتا رہا اور بقول اقبال۔ ؎

ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم

سرسید کا بیان ہے کہ سید شہیدؒ کے چودہ پندرہ سال بعد تک مجاہدین جہاد کے جذبہ سے سرشار سرحدی علاقوں میں "بہ نیت جہاد" پہونچتے رہے۔

انگریزوں نے مجاہدین کے ساتھ جو ظالمانہ برتاؤ کیا اور ان کی بیخ و بن اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی، وہ تاریخ بھلا نہیں سکتی ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے جن علماء و مجاہدین کو خاص طور پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ان میں خاصی تعداد مجاہدین کے گھرانوں کی تھی ۱۸۶۴ء کے انبالہ بغاوت مقدمہ، ۱۸۶۵ء کے پہلے مقدمہ بغاوت پٹنہ، ۱۸۷۰ء کے مالدہ بغاوت کیس، اور راج محل بغاوت مقدمہ، اور ۱۸۷۱ء کے دوسرے پٹنہ بغاوت کیس میں مجاہدین کے خاندان جس طرح برطانوی مظالم کا شکار بنے ان کی داستان دردناک ہے۔ "الدر المنثور" میں مولانا عبدالرحیم نے اپنے چچا مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور دیگر مجاہدین کے حالات لکھے ہیں ۱۸۶۵ء میں عید کے دن ان کے مکانوں کو جس طرح مسمار کیا گیا، اس کا حال مولانا عبدالحمید نے ایک مثنوی میں لکھا ہے۔

چوں شب عید را سحر کردند
ہمہ را از مکاں بدر کردند
ضبط و تاراج جملہ مال و متاع

اشتر و فیل و گاہ و اشتر و اسپ
باغ را و منازل دل چسپ
آں بنا ہائے شامخ و محکم
کہ بہ گیتی بود عدیلش کم
اندراں خانہ طالباں چوں نجوم
روز و شب مشتغل بہ درس علوم
جملہ دیوار و سقف و خانہ و در
بیل زن کردہ منہدم یکسر!

ہندوستان میں جنگ آزادی کی تاریخ سید شہیدؒ سے شروع ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے خون سے آزادی کے جس پودے کی آبیاری کی تھی، وہ ایک ایسے وقت میں برگ و بار لایا جب کوتاہ بین نظریں ان گذرگاہوں کو بھول چکی تھیں جہاں سے حریت اور آزادی کے ان علم برداروں کا قافلہ گذرا تھا۔

اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ جنگ آزادی سید احمد شہیدؒ کی اس عظیم الشان تحریک کا صرف ایک پہلو ہے۔ بعض اوقات ہم کسی ایک پہلو پر اس طرح نظریں مرکوز کر دیتے ہیں کہ تحریک کی مجموعی حیثیت اور اس کے مقصد و منہاج کے متعلق محدود تصورات نشو و نما پا جاتے ہیں۔ سید شہیدؒ جس مقصد کے لیے میدان عمل میں داخل ہوئے تھے وہ عقیدۂ توحید کو مسلمانوں کی حیات اجتماعی میں ایک زندہ حقیقت کی حیثیت سے بیدار کرنا تھا۔ وہ یہ احساس پیدا کرنا چاہتے تھے کہ:۔

ہے زندہ وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوت بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خداداد

عقیدۂ توحید سے جو نظام وجود میں آتا ہے اس میں انسانیت کے لیے فوز و فلاح

کا پیغام ہے۔ "تقویۃ الایمان" میں توحید کو زندگی کے ہر شعبہ میں ایک زندہ حقیقت کی حیثیت سے دیکھنے اور بدعات سے اس تصوّر کو پاک کرنے کی کوشش براہ راست دل پر اثر کرتی ہے اور یہ احساس شدید ہو جاتا ہے کہ ؎

زندہ قوّت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علم کلام

سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کو اسلام کی تاریخ کے وسیع چوکھٹے میں سمجھنے اور پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

تعجب ہے کہ اس تحریک کے فکری اثرات کا جائزہ پورے طور پر نہیں لیا گیا۔ بعض معاصرین نے جو سیّد شہیدؒ کے خلوص، جذبہ اور جدوجہد سے بے حد متاثر تھے سیاسی حالات کے پیش نظر بعض پہلوؤں کو دبا کر پیش کیا۔ سرسیّد نے انگریز کے انتقامی جذبے سے بچانے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ بعض حلقوں میں اُن کی تحریک جہاد کو تو نظر انداز کر دیا گیا، ان کی خانقاہی نظام کی تنقید کی نشانہ، ہدف بنا لیا گیا۔ ضرورت ہے کہ تحریک کے اثرات کا جائزہ وسیع پس منظر میں لیا جائے۔

سرسیّد، اُن کے معاصر تھے۔ جب آثار الصنادید لکھنے بیٹھے تو ۱۴، ۱۵ سال سیّد احمد شہیدؒ اور مولانا محمد اسمٰعیلؒ کی شہادت کے ہو چکے تھے، لیکن جب ان کا حال لکھا تو اُن کا قلم وجد کرنے لگا ان کے حرف حرف سے عقیدت اور محبّت کا جذبہ ٹپکتا تھا۔ سرسیّد کو تقلید سے آزادی اُن ہی کی تحریک سے ملی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کا پیرو بتاتے تھے اور "تقویۃ الایمان" کے متعلق کہتے تھے کہ یہ "محبّت الٰہی" میں لکھی گئی ہے (خطوط ص ۳) انھوں نے ایک رسالہ "راہ سنّت در ردِّ بدعت" لکھا تھا جس میں یہ اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ حالی نے "حیات جاوید" میں لکھا ہے:۔

"مولانا اسمٰعیل شہید کی تصانیف نے ان کے خیالات کی اور زیادہ اصلاح کی۔"

(حیات جاوید ص ۳۰۴)

اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کی سماجی اور مذہبی اصلاح کی تاریخ مولانا سیّد احمد شہیدؒ

سے شروع ہوتی ہے۔ بعد کو سرسیدؒ نے ان کی تقلید میں قدم آگے بڑھایا لیکن ان کے حالات اور مسائل اور تھے، اس لیے اُن کی تحریک دوسرا رُخ اختیار کر گئی۔

پھر حالیؔ بھی سیّد شہیدؒ اور خاندان ولی اللّٰہی کی مذہبی سرگرمیوں سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے ایک زمانہ میں نواب صدیق حسن خاں کی تائید میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ ایک بار غائب کو نماز کی پابندی نہ کرنے پر مذہبی اور احتسابی انداز میں متوجہ کیا تھا۔ اُن کی "بیوہ کا مناجات" سیّد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک نکاح بیوگان کی صدائے بازگشت ہے۔ وہ سوشل ریفارم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مسلمانوں میں ظاہراً دو شخصیتوں کے سوا دونوں دلّی کی خاک سے اُٹھے، کسی نے سوشل رفارم پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ ایک مولانا اسمٰعیل، دوسرے سیّد احمد خاں"

(حیات جاوید ص ۶۴۱)

سرسیّد، مولانا اسمٰعیلؒ کی حق گوئی کے قائل تھے اور یہ ایک ایسا وصف تھا جس کی اپنے عہد کے علماء میں کمی پاتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میں بڈھا ہوں اور اپنی عمر میں ہر فرقے کے بہت بڑے بڑے شخصیتوں کو دیکھا ہے۔ اسی چیز نے اور اسی خیال نے کلمۃ الحق کے کہنے سے ان کو باز رکھا۔ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اگر اسی قسم کے خیالات میں مبتلا رہتے تو ہندوستان میں شرک و بدعت کی تاریکی کیسے دور ہوتی"۔ (خطوط ص ۱۶۹)

بعد کے دور میں مولانا، ابوالکلام آزاد، سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کے زبردست معترف تھے۔ انھوں نے مولانا عبدالرّحیم کی الدرّ المنثور" پر اپنی نوجوانی میں مقدمہ لکھا تھا۔ ان کے استاذ مولانا محمّد یوسف رنجور کے باپ مولانا محمّد یحییٰ علی تحریک مجاہدین کے زبردست مبلّغ تھے۔ اُن کی ساری جائداد ضبط کر لی گئی اور ان کو انڈمان بھیج دیا گیا۔ وہاں سے انھوں نے اپنی اہلیہ کو خط لکھا کہ "خدا کا شکر ہے کہ تم کو اس آزمائش کے لیے منتخب کیا گیا"۔ یہ جذبہ جانسپاری، سیّد احمد شہیدؒ کی سرکردگی میں ہر مجاہد کے دل کو گرمائے ہوئے تھا۔ مولانا آزاد کے دور رفیق۔ اجمل خاں اور ہمالوں کبیر ـــــ مجاہدین کے خاندان سے تھے۔ مولانا آزاد نے "تذکرہ" میں جس طرح

سید شہیدؒ کی تحریک کو اسلام کی تاریخ عزیمت میں جگہ دی ہے، وہ اُن کی فکر کے بنیادی خطوط کو روشن کرتی ہے۔ ایک ایک لفظ سے عقیدت کا جذبہ اور اتباع کا جوش ٹپکتا ہے۔ وہ حال اپنا لکھ رہے تھے، لیکن سید شہیدؒ نے ان کی شخصیت پر جو اثر ڈالا تھا، اس کے پیش نظر وہ اُن کو بھلا نہ سکتے تھے۔ ایک بار خاکسار سے گفتگو میں فرمانے لگے:

میرے والد کی ولادت ۱۸۳۱ء میں ہوئی تھی، اسی سال جب جنگ بالاکوٹ لڑی گئی تھی اتنا کہہ کر انھوں نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کرلیں اور میں نے ایسا محسوس کیا کہ وہ ماضی کے گریزپا نظاروں کو اپنے تصور میں مقید کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب آنکھیں کھولیں اُن میں ایک خاص چمک تھی۔ اُن کے باپ اگر جنگ بالاکوٹ کے سال میں پیدا ہوئے تھے انھوں نے اپنی زندگی اس مسلک اور ان مجاہدانہ سرگرمیوں کی تائید میں صرف کردی۔ جو سید شہیدؒ کی جہد و سعی کا مرکز و محور تھا۔ ضرورت ہے کہ مذہبی، ادبی، سماجی، سیاسی سب میدانوں میں سید شہیدؒ کی تحریک کے عمل اور ردِ عمل کا تجزیہ کیا جائے۔ سرسید، حالی، آزاد اپنے اپنے مخصوص میدانوں میں ممتاز تھے، لیکن تینوں سید شہیدؒ کی تحریک سے متاثر تھے۔ ہنٹر (HUNTER) کے بیانات کتنے ہی متعصبانہ ہوں، لیکن ان سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سید شہیدؒ کے اثرات کا دائرہ کتنا وسیع تھا اور حکومت ان سے کتنی خائف تھی۔ جب ۱۸۹۱ء میں واقعہ بالاکوٹ کے ۶۳ سال بعد سید عبدالحی صاحبؒ نے شمالی ہندوستان کے بعض اہم مقامات کا دورہ کیا تو اُن کو سید شہیدؒ کے خاندان کے چشم و چراغ کی حیثیت سے سر اور آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ مولانا ذوالفقار علی نے اُن کو بتایا تھا کہ سید صاحبؒ جن جن قصبات میں تشریف لے گئے وہاں اب تک خیر و برکت کا ماحول ہے وہ گویا ایک نور مستطیل ہے کہ جدھر گئے اُدھر وہ پھیل گیا۔[1]

سید صاحبؒ کے معاندین نے اُن کی بابت جو کچھ لکھا ہے وہ تعصب اور تنگ دلی پر مبنی ہے مستشرقین اگر ایک طرف سیاسی مصلحتوں سے مجبور تھے تو دوسری طرف ان کی محرومی یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی دینی، ملی اور فکری تحریکوں کے خاموش اشاروں کو سمجھنے سے معذور تھے۔ وہ رائے بریلی

---

[1] دہلی اور اس کے اطراف۔ از مولانا حکیم سید عبدالحی ص ۱۱۴-۱۱۵

کو ایک غیر معروف قصبہ اور سید احمد شہیدؒ کو ایک غیر معروف خاندان کا فرد اور بعض فرقوں کے قبیلے سے متعلق سمجھتے رہے۔ حالانکہ رائے بریلی میں اس وقت اسلامی ہند کا دل دھڑکتا تھا اور سید احمد شہیدؒ سادات حسنی کے چشم و چراغ تھے۔ دہلی سے حکمت ولی اللہی کا چشمہ رائے بریلی پہونچ چکا تھا اور ایک دوسرے سفر کی تیاری میں مصروف تھا۔ لیکن ان کی نگاہیں ان حقائق کا جائزہ نہ لے سکیں ۔ Carre Hardy Hughes وغیرہ کے بیانات تعصب اور جہالت پر مبنی ہیں۔ لیکن وہ اگر سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک کے حقیقی خدوخال کو نہ دیکھ سکے تو یہ چشمہ آفتاب را چہ گناہ؟

بعض مسلمان مصنفین نے جس طرح سید شہیدؒ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ان پر بے بنیاد اعتراضات عاید کئے ہیں، ان کا جواب محترم المقام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نے تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ میں جس بصیرت افروز انداز میں دیا ہے اس پر اضافہ ممکن نہیں۔

سید شہیدؒ کا عقیدہ تھا کہ ؎

ازاں کشت خرابے حاصلے نیست
کہ آب از خون شبیرے ندارد !

چنانچہ انھوں نے صدا بلند کی:۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری !

اللہ نے ان کو رسم شبیری پورا کرنے کی سعادت بخشی۔ جنھیں یہ سعادت میسر نہ آسکی انھوں نے اپنی گردنیں عظمت گذشتہ کے ریگ زار میں چھپالیں اور وقت کی یہ پکار ان کے کانوں تک نہ پہونچ سکی۔

یہ حکمت ملکوتی، یہ علم لاہوتی !
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

جنھوں نے آنکھیں کھلی رکھیں وہ بھی اس علمبردار توحید کے مقاصد کو نہ سمجھ سکے، کیونکہ

وہ بدعات و احداث کی دنیا میں گم تھے۔ بقول اقبالؔ

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے!
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

جو خود صنم خانہ بن چکے تھے، اُن تک یہ صدا کیسے پہونچ سکتی تھی۔ انھوں نے نہ رسم و رہ خانقہی کا ناقدانہ جائزہ لیا، نہ ان کی کی نوائے سحری کا مقصود سمجھا۔ سیّد شہیدؒ تصوّف کو "احسان" کی روشنی میں دیکھتے تھے۔ اُن کو اس کا مخالف بنا کر پیش کرنا حقائق سے چشم پوشی ہے۔ "صراط مستقیم" کے آخری ابواب میں تصوّف کی گمراہیوں کی اصلاح ہے اور "احسان" کو رہبر بنایا گیا ہے۔ "راہِ نبوّت" کا انھوں نے جس طرح تجزیہ کیا ہے وہ ان کی فکر کی بنیادی حقیقتوں کو واضح کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں "عبقات" کا عبقہ ۲۴ جس میں "خوش اعتقادوں کی توحید" پر گفتگو کی ہے، لائق مطالعہ ہے۔

بعض معترضین نے سرحدی علاقے کو تحریک کا مرکز بنانے پر اعتراض کیا ہے۔ اُن کو سر ہملٹن گب کا وہ جواب پیش نظر رکھنا چاہیے جو اس نے محمدؐ بن عبدالوہاب کے سلسلہ میں دیا ہے:

> ".....He had selected as the nucleus of his movement a region which was out of reach of an organised political authority, where there was therefore, an open field for the propagation of his teachings and where, if he were successful, he might be able to build up a strong theocratic organization by the aid of warlike tribesmen."
>
> (Modern Trends In Islam p. 26)

"انھوں نے اپنی تحریک کے مرکز کے لیے ایک ایسے خطّہ کا انتخاب کیا جو کسی مضبوط سیاسی قوّت کی دسترس سے باہر ہو اور جہاں وہ اپنی تعلیمات کو پھیلا سکیں اور کامیابی کی صورت میں ایک مضبوط مذہبی تنظیم جنگجو قبائلیوں کی مدد سے قائم کر سکیں۔"

بعض مصنّفین نے تحریک مجاہدین کو محمدؐ بن عبدالوہاب کی تحریک کا چربہ اور اس سے کلّی طور پر متأثر بتایا ہے۔ یہ خیال بھی اصلاح طلب ہے۔ سیّد شہیدؒ حجاز قیام کے زمانہ میں نجدی تحریک سے واقف ضرور ہوئے اور تنظیمی اعتبار سے ممکن ہے بعض چیزیں قبول بھی کی ہوں، لیکن تحریک کی سمت اس کا مقصد و منہاج، اس کا طریقۂ کار، اس کی فکری اساس ان کی اپنی تھی

میں نے اپنے ایک مضمون میں جو اسلامک کلچر میں شائع ہوا ہے (جولائی ۱۹۷۰ء) اس پہلو پر مختصراً گفتگو کی ہے۔

بعض معاندین نے حق و صداقت کا دامن اس طرح ہاتھ سے چھوڑ دیا کہ حضرت سید شہیدؒ پر خود غرضی اور تنگ نظری کے الزام لگانے لگے۔ انھوں نے صحیح تصویر پیش کرنے کا دعویٰ کیا اور حقیقت کو مسخ کر دیا۔ اُن سے تو حالی کا صرف یہ شعر کہا جا سکتا ہے ؎

انھوں نے خود غرض شکلیں کبھی دیکھی نہیں شاید
وہ جب آئینہ دیکھیں گے تو ہم دکھلائیں گے ان کو

بعض معاندین نے عمداً ان کے جنگ آزادی کے عزائم کو غلط پیش کیا، گو بالاکوٹ کی فضائیں پکارتی رہیں۔

مرا گلچیں بد آموز چمن خواند
کہ داد م چشم نرگس را نگاہے

حقیقت یہ ہے کہ آزادی کی جد و جہد میں سید شہیدؒ کے کارنامے کبھی فراموش نہیں کیے جا سکتے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

شعری حصّہ

حکیم مومن خاں مومنؔ

مُناجات

نہ کیوں کر مطلع دیواں ہو مطلع مہر وحدت کا
کہ ہاتھ آیا ہے روشن مصرع انگشتِ شہادت کا

بچاؤں آبلہ پائی کو کیوں کر خارِ ماہی سے
کہ بامِ عرش سے پھسلا ہے یارب پاؤں وقت کا

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

خدایا ہاتھ اٹھاؤں عرضِ مطلب سے بھلا کیوں کر
کہ ہے دستِ دعا میں گوشۂ داماں اجابت کا

فروغِ جلوۂ توحید کو وہ برقِ جولاں کر
کہ خرمن پھونک دیوے ہستیٔ اہلِ ضلالت کا

مرا جوہر ہو سرتا پا صفائے مہرِ پیغمبر
مرا حیرت زدہ دل آئینہ خانہ ہو سنّت کا

خدایا لشکرِ اسلام تک پہنچا کہ آ پہنچا
لبوں پر دم بلا ہے جوشِ خوں شوقِ شہادت کا

امیرِ لشکرِ اسلام کا محکوم ہوں یعنی
ارادہ ہے مرا فوجِ ملائک پر حکومت کا

زمانہ مہدیٔ موعود کا پایا اگر مومنؔ
تو سب سے پہلے تو کہیو سلامِ پاک حضرت کا

حکیم مومن خاں مومنؔ

مثنوی جہاد

(امیر المومنین سیّد احمد رائے بریلوی، اور قائد جیوش اسلام شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی کی تائید میں)

پلا مجھ کو ساقی شراب طہور — کہ اعضا شکن ہے خمارِ فجور
کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا — کہ آجائے بس نشّہ اسلام کا
یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال — کہ گردن کشوں کو کروں پائمال
بہت کوشش و جاں نثاری کروں — کہ شرعِ پیمبرؐ کو جاری کروں
زہے سید احمد قبول خدا — سر امتحان رسول خدا
خبردار ہو جاؤ اے اہلِ دل — کہ رحمت برستی ہے اب متصل
امام زمانہ کی یاری کرو — خدا کے لئے جاں نثاری کرو
کسی کو نہیں ہے اجل کی خبر — کہ آجائے بیٹھے ہوئے اپنے گھر
تو بہتر یہ ہے کہ جاں کام آئے — پسِ مرگ تربت میں آرام آئے
الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب — یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
تو اپنی عنایت سے توفیق دے — عروجِ شہید اور صدیق دے
دعا ہو یہ مقبول درگاہ میں — مری جاں فنا ہو تری راہ میں

میں گنجِ شہیداں میں مسرور ہوں
اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

حکیم مومن خاں مومن دہلوی

امام جہانیاں احمد

گلاب ناب سے دھوتا ہوں مغز اندیشہ
کہ فکر مدحتِ سبط قسیم کو تر ہے

وہ کون امام، امام جہانیاں احمد
کہ محض مقتدی سنت پیمبرؐ ہے

زمیں کو مہر فلک سے نہ کیوں ہو دعوی تو
کہ اس کا سایۂ اقبال سایہ گستر ہے

زبس کہ کام نہیں ہے اسے سوائے جہاد
جو کوئی اس سے مقابل ہے سو وہ کافر ہے

شرف ہے مہر کو اس کے زمانے سے دائم
زبسکہ روز و شب انصاف سے برابر ہے

وہ بادشاہ ملائک سپاہ، کوکب دیں
کہ نور شمس و قمر جس کے گرد لشکر ہے

وہ شعلہ خصلت و حسّاد سوز و کفر گداز
کہ جس کا نقش قدم مہر روز محشر ہے

وہ برق خرمن ارباب شرک و اہل ضلال
کہ شعلہ خوشۂ حاصل تو دانہ اخگر ہے

وہ قہرمانِ فلک توسن و نجوم حشم
کہ ترک چرخ غلام اس کا مہر چاکر ہے

وہ شاہ مملکت ایماں کہ جس کا سال خروج
امام برحق مہدی نشاں علی فر ہے

علامہ اقبال

مردِ قلندر

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گِل کوشند
ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بجلوت اندو کمندے بہر دمہ پیچند
بخلوت اندو زمان و مکاں در آغوشند
بروزِ بزم سراپا جو پرنیاں و حریر
بروزِ رزم خود آگاہ و تن فراموشند
نظامِ تازہ بچرخِ دو رنگ می بخشند
ستارہ ہائے کہن را جنازہ بر دوشند

علامہ اقبال

مقامِ عاشقی

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ می خواہی، ز خاکی بیش ازاں خواہی

چناں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا
شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی

حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے مزار پر

(مولانا محمد ثانی الحسنی)

۱۹۵۵ء میں پہلی بار بالاکوٹ جانا ہوا تو عین مغرب کے وقت حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے مزار پر حاضری دی۔ ان کی زندگی اور راہِ خدا میں شہادت کا نقشہ آنکھوں میں آگیا اور دل بیحد متاثر ہوا اور وہ اثر اشعار کی شکل میں زبان سے ظاہر ہوا۔

ارض بالاکوٹ پر بہتا ہے دریائے کنہار
مغربی جانب ہے اس کے ایک گرتا آبشار

چند کھیتوں کے کنارے ست بنے نالہ کے پار
چار دیواری کے اندر ایک واقع ہے مزار

تھی فضا خاموش بیحد پُرسکوں ماحول تھا
وقت مغرب ہو رہا تھا سامنے تھا سبزہ زار

قبر پر چادر نہ تھی روشن نہ تھا کوئی دیا
اور پھولوں کا مجھے کوئی نظر آیا نہ ہار

تھی مگر اتنی کشش اتنا جمال اتنا جلال
ٹھہرتی آنکھیں نہ تھیں دل ہو گیا بے اختیار

یہ ہے مرقد حضرت مولانا اسمٰعیلؒ کا
مردِ مومن علم کے دریائے ناپیدا کنار

وہ عظیم المرتبت انسان حق کا پاسباں
جو شریعت کا نشاں تھا زہد و تقویٰ کا شعار

خاک میں جس نے ملایا کفر کا سارا غرور
کر دیا جس نے ردائے شرک و بدعت تار تار

خاندانِ شاہ ولی اللہ کا چشم و چراغ
معترف تھا جس کے علم و فضل کا سارا دیار

نائبِ ختمِ رسالت ہادی راہِ ھدیٰ
مرد دانا، مردِ حق، علم و عمل کا تاجدار

سارے خطۂ ہند کے ہیں اس کی عظمت کے گواہ
سرحد و پنجاب و یوپی، اور بنگال و بہار

دلپذیری جس کی تقریروں کی اب تک یاد ہے
توبہ کرنے والیوں کی وہ قطار اندر قطار

جب پکارا سید احمد مردِ حق آگاہ نے
پڑ گیا قدموں میں ان کے چھوڑ کر اپنا دیار

اللہ اللہ عشق کیسا ہو گیا تھا شیخ سے
شیخ کے دامن کو تھاما پھر چلا مستانہ وار

ہند میں وہ مردِ حق اللہ کی تلوار تھا
ہو گئے حملے سے اس کے کتنے طاغوتی شکار

دربدر اس کو لئے پھرتا رہا شوقِ جہاد
شہر و قریہ وادیاں جنگل بیاباں کوہسار

ہو گیا آخر شہید آکر کے بالاکوٹ میں
جھومتا بڑھتا ہوا وہ شوق میں دیوانہ وار

زندگی بھر جس نے توڑا شرک و بدعت کا صنم
اس کے مرقد پر پڑے پھر شرک و بدعت کا غبار

ظلم کتنا ہے اسے کچھ لوگ کہتے ہیں بُرا
جس نے حق پر جان دی اور کر دیا تن من نثار

نفس کے بندے اسے دیتے ہیں جتنی گالیاں
اتنا آتا ہے خدا کو اس مجاہد پر پیار

فاتحہ کے واسطے میں نے اٹھایا ہاتھ کو
اور یہ الفاظ تھے میری زباں پر بار بار

اے عظیم المرتبت انسان! تجھ پر ہو سلام
آفتابِ علم و تقویٰ اے خلیق و بردبار

خاک و خوں میں تھا تڑپنا صرف حق کے واسطے
تجھ پہ نازل رات دن ہو رحمتِ پروردگار

دے جزا تجھ کو قیامت میں خداوندِ کریم
ساری ملت کی طرف سے بے حساب و بے شمار

ہے ضرورت آج تیری جرأتِ بیدار کی
دین پر پھر سے کیا ہے شرک نے بھرپور وار

میں نے اتنا ہی کہا تھا غیب سے آئی صدا
دیر سے اس قبر پر تو ہو رہا ہے اشکبار

بات تو جب ہے کہ تو اس مردِ دانا کی طرح
بے جھجک آگے بڑھے حق پر کرے تن من نثار

آج پھر دینِ خدا پر آندھیوں کا زور ہے
گلشنِ اسلام سے روٹھی ہوئی ہے پھر بہار

بدنصیبی ہے کہ خود اپنے پرائے ہو گئے
آج پھر اسلام ہے جبر و تشدد کا شکار

خوب ہے وہ مرد جس کو درد ہو اسلام کا
دین کا خادم ہو دن میں اور ہو شب زندہ دار

تجھ کو سیدؒ اور اسماعیلؒ دیتے ہیں پیام
عیش کی کیا زندگانی موت سے ہو ہم کنار